آئینہ
میرے دادا گھوڑوں کے سوداگر تھے ان کی دوستی مشہور انگریز صحافی اور ناول نگار روڈیارڈ کپلنگ سے تھی۔ ڈاکٹر وزیر آغا
گھوڑوں کے ایک سوداگر نے مجھے سولہ ہزار روپے، ایک خوبصورت لڑکی اور چار اعلی النسل کے گھوڑے بطور رشوت پیش کیے۔ روڈیارڈ کپلنگ

دشمن کو نہ مارو اگر مارو تو تمہاری ضرب کی آواز
سترھویں صف میں سنائی دے۔

(حضرت علیؓ)

سر تیج بہادر سپرو

سر تیج بہادر سپرو

آپ ۸؍دسمبر ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا پنڈت رادھا کشن سپرو اس صوبہ میں ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر مامور تھے۔ اور ایام غدر میں اپنی ممتاز خدمات کے صلہ میں کچھ زمینداری بطور انعام ومعافی ضلع علیگڑھ میں پائی۔

سر تیج بہادر سپرو نے ابتدائی تعلیم متھرا ہائی اسکول میں پائی اور ۱۸۹۴ء میں اپنی غیر معمولی ذہانت سے بی۔اے کا امتحان انگریزی زبان میں اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور ۱۸۹۵ء میں ایم۔اے پاس ہوئے اور انگریزی میں اول آئے۔ اسی سال ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ۱۸۹۶ء میں مرادآباد میں وکالت شروع کی۔ ۱۸۹۸ء میں الہ آباد تشریف لائے اور ۱۹۰۱ء میں اعلےٰ امتحان قانون میں طغرائے امتیاز حاصل کیا۔ ۱۹۰۲ء میں ایل ایل ڈی ہوئے اور ۱۹۰۳ء سے کچھ عرصہ تک مقامی لاکالج میں ریڈر کے عہدے پر فائز رہے۔ آپ ابتدا سے کانگرس میں شریک تھے اور چند سال تک صوبہ کانگرس کے صدر رہے۔ جب اعتدال پسند جماعت نے کانگرس سے کنارہ کشی اختیار کی تو آپ لبرل فیڈریشن کے صدر قرار پائے ۱۹۱۳ء میں سر جیمس مسٹن نے صوبہ کی مجلس واضعین قانون کا رکن منتخب کیا اور ۱۹۱۶ء میں مرکزی مجلس واضعین قانون کے ممبر منتخب ہوئے ۱۹۱۸ء میں ساؤتھ برا کمیٹی کے ممبر رہے اور ۱۹۲۰ء میں لارڈ چیمسفورڈ کی گورنمنٹ میں بحیثیت مشیر قانونی شریک ہوئے کچھ عرصہ کے بعد تندرستی نے اجازت نہ دی اور اس لئے جنوری ۱۹۲۲ء میں مستعفی ہوگئے۔ جنوری ۱۹۲۳ء میں کے۔سی۔ایس۔آئی کے خطاب سے ممتاز کئے گئے۔ کسی زمانہ میں کچھ عرصہ تک کاشمیری درپن کے نام سے ایک رسالہ نکالتے رہے جس کے اجرا کا ایک مقصد کشمیریوں کے حقوق کی حفاظت ونگہداشت تھی۔ اردو زبان سے آپ کو بچپن ہی سے ایک خاص شغف تھا اور آپ ہمیشہ اس کی ترقی اور توسیع میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ شاعری میں آپ کے مذاق کا معیار بہت بلند ہے اور مرزا غالب مرحوم کے بڑے مداح ہیں "آئینہ" کا وجود آپ ہی کی مسیحا نفسی اور چشم کرم کا ممنون ہے اور آپ ہی کی فیاضی اور علم پروری سے مذکور کے قیام واستحکام کی تکمیل ہے۔

عکس سے کس کے یہ حیرت زدہ ہے ہم آغوش ‏— آئینہ بزم ادب میں جو ہوا جلوہ فروش

کون ذی مرتبہ سر تیج بہادر سپرو ‏— ناز قانون کو ہے جس پہ وہ سر چشمۂ ہوش

صاحب ہمت عالی کہ نہیں جس کی نظیر ‏— ارتقا میں جو ثریا سے ہوا دوش بدوش

دل ہے فیاض تو آنکھوں میں ہے کیفِ اخلاق ‏— علم پرور ہے نگہ گوش اگر عذر نیوش

ملک در ملک ہیں افعال اِدھر درس آموز ‏— چمن اندر چمن اخلاق اُدھر عطر فروش

جس کی بالغ نظری اہل نظر میں مشہور ‏— خاصہ جس کی طبیعت کا ہے سعیِ خاموش

جسم قانون میں اک روح ہے وہ بھی بیدار ‏— پیکر ہند میں اک دل ہے وہ دل بھی پرجوش

مشکل چال سیاست کے ہر اک جادے پر ‏— ملک سے بےخبری ہے نہ بہت جوش وخروش

بادہ شوق سے سرشار دل علم پرست
نگہِ فیض رسان نغمہ زنِ نوشانوش

آئینہ خانہ

دنیائے صحائف کی رسم قدیم کے موافق میرا فرض تھا کہ میں بھی اس موقع پر ایک طویل "مقالۂ افتتاحیہ" لکھتا، ایک بلیغ "خطبۂ ادارت" سناتا، ایک لمبی "تقریب" سے پہلی اشاعت کو زینت دیتا "عرض تمنا" کتا یا "حدیث آرزو" سناتا لیکن درحقیقت یہ فرائض ایک ایسے اڈیٹر یا مدیر کے ہیں جو ادارت کی اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونیکی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ اور جو حقیقی معنوں میں مدیر اور رئیس تحریر کہلائے جانیکا اہل اور مستحق ہے لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے مجھے اپنی کم مایگی اور بیچارگی کا کافی احساس ہے اور میں کبھی بھی مدیر یا رئیس التحریر بننے کی جرات نہیں کرسکتا۔ میری مثال تو اس شہد کی مکھی کی سی ہے جو مختلف رنگ و بو کے پھولوں کا رس لیکر شہد جمع کرتی ہے۔ اگر میں ترتیب و تہذیب کے فرائض حسب دلخواہ انجام دیسکا تو میں سمجھونگا کہ میری ناچیز کوششیں مشکور ہوئیں۔

آئینہ کے اجرا کا ایک مقصد زبان اُردو کا صحیح اور سچا معیار قائم کرنا ہے۔ لیکن یہ کام ایک دن کا یا کسی ایک شخص کے امکان کا نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ حامیان اُردو اپنی پوری توجہ سے کام لیں۔ اور اس اہم کام میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ اس ضمن میں سید مسعود حسن صاحب رضوی کا محققانہ مضمون "سارے ہندوستان کی ایک زبان" جو پہلی اشاعت کی زینت کا سبب ہے، خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ سید صاحب آئینہ کے مخصوص مقالہ نگاروں میں ہیں اور علم لسان موصوف کے موضوعات مخصوصہ میں ہے۔ ہمیں امید ہے کہ حامیان اُردو ان تجویزوں اور نیک مشوروں پر غور کرینگے جو سید صاحب موصوف اپنے عالمانہ مضمون میں ہر بہی خواہ زبان کی غور و فکر کے لئے پیش کرتے ہیں۔ ہماری رائے میں سیاسی نقطۂ خیال سے اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ اُردو کو عربی و فارسی کی غیر مانوس اور غریب الفاظ و ترکیبوں سے محفوظ رکھا جائے۔ تاکہ اُردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان قرار پاسکے لیکن کسی حالت میں اسکے یہ معنی نہیں کہ عربی و فارسی کے وہ الفاظ اور ترکیبیں جن سے ہمارے کان آشنا ہیں اور جو ہماری زبانوں پر رواں ہیں۔ ترک کردئے جائیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ذی علم اور بالغ نظر مضمون نگار حضرات آئندہ اشاعتوں میں اس بحث کے ہر پہلو پر کافی روشنی ڈالینگے تاکہ بحث و مباحثہ کے بعد معیار زبان کے متعلق ایک صحیح رائے قائم کی جاسکے۔

آئینہ کے اجرا کی ایک غرض جنس نازک کے حقوق کی حفاظت اور انکی دماغی و ذہنی نشو و نما کے اسباب فراہم کرنا بھی ہے۔ اس اہم فرض کی ذمہ داری ہمارے نہایت عزیز دوست شاہ نذیر صاحب ہاشمی کے سر ہے جنھوں نے اپنے اوقات کا ایک بڑا حصہ "فطرت" کی اس لطیف ترین "تصنیف" کے مطالعہ میں گذارا ہے۔ ان کا دلچسپ مضمون "حسینوں کی حسین بغاوتیں" نہایت خوب ہے۔ اور طبقہ ذکور کے ان افراد کے خاص توجہ کا مستحق ہے جو بیسویں صدی کے "مبارک سنین" میں بھی "دست قدرت" کے اس بہترین نقش "کو "نقش قالیں" سمجھکر اس کی روح پرور شادابی و شگفتگی کو پامال کرنا چاہتے ہیں: عورت رنگینیوں کی ایک دنیا ہے، جس کے فطرت کی تخمیر تکبیر محبت و وفا سے کی گئی ہے!! اس کی صنف کا وجود وہ شگفتہ پھول ہے جو نسل انسانی کو زندگی روح اور روح کی خوشبو سے معطر کر رہا ہے!!! لیکن افسوس! درندہ صفت اور خونخوار درشت انسان اس لطیف جنس کی قدر نہیں جانتا! وہ اسے پامال کرنے پر آمادہ اور اس کی رنگینیت کے مٹانے پر تلا ہوا ہے۔ حق و انصاف کے دروازے پر بند کردئے گئے ہیں اور اس مظلوم ہستی کی فریاد سننے کے لئے آج مرد.ں کی دنیا میں کوئی عدالت موجود نہیں۔

ہمارا ارادہ تھا کہ "آئینہ" کے اوراق لطیف ادب یعنی محض ڈراموں، افسانوں اور نظموں کے لئے مخصوص کر دئے جائیں لیکن لاہور کے ایک مقتدر معاصر کی مثال پیش نظر ہے اور اہل ذوق کی بےنیازیوں سے جرأت نہیں ہوتی کہ ہم بھی اس میدان میں گامزن ہوں جس میں ہم سے پہلے اکثر حامیان ادب جو ہم سے کہیں زیادہ اس خدمت کے اہل تھے ٹھوکریں کھاکر ناکامیاب رہ چکے ہیں۔ لہذا ہم فی الحال اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ "آئینہ" میں غالب عنصر لطیف ادب کا رہے گا۔ اس سلسلہ میں میرے کرم دوست پروفیسر بدری پرشاد صاحب رنگین کا نہایت کامیاب ڈرامہ "سپوت بیٹا" قابل ملاحظہ ہے۔ موصوف نے یہ ڈرامہ اسٹیج کے لئے لکھا ہے اور اس بنا پر ممکن ہے اس میں ادبی نقطۂ نگاہ سے جابجا کچھ خامیاں موجود ہوں لیکن ہر وہ ناقد جو اس فن سے واقف ہے بے اختیار

کہدیگا کہ یہ ڈرامہ بحیثیت ڈرامہ کے انکے کمال فن کا ایک زبردست اور بہترین نمونہ ہے۔

"حامد جمال" کا درس انقلاب شیلر کے مشہور ڈرامے "ولیم ٹل" سے ماخوذ ہے اور سلاست بیان کے لحاظ سے نہایت خوب ہے۔

ناچیز کا افسانہ "صبح شباب" جو "نگار" میں باقساط شائع ہو رہا ہے اور جو رسالۂ مذکور کی اجازت سے آئینہ میں نقل کیا جا رہا ہے، اردو ناول نگاری کی فرسودہ اور پامال شاہراہ سے بالکل ہٹ کر لکھا گیا ہے، اور اپنی جدید روش کے لحاظ سے ناقدین کی خاص توجہ کا محتاج ہے۔

آئینہ کے مخصوص قلمی معاون مولوی محمد متین صاحب کا عالمانہ مضمون "سائنس اور مذہب" جو اس رسالہ کی متعدد اشاعتوں میں پورا ہو سکیگا زبان اردو میں ایک گراں قدر اضافہ ہے لیکن جی یہ چاہتا تھا کہ ایسا بے مثل علمی مضمون کسی قدر اور عام فہم اور سلیس اردو میں لکھا جاتا۔ تاکہ وہ حضرات جو عربی سے ناواقف ہیں اور اردو کو عربی کا اس درجہ دست نگر دیکھنا پسند نہیں کرتے اس مضمون سے بہرہ اندوز ہو سکتے۔

افسوس ہے کہ باوجود کوشش بلیغ علامہ اقبال مدظلہ، حالی کی تازہ نظم اس اشاعت کے لئے دستیاب نہ ہو سکی اور چونکہ ہم پہلی اشاعت کے لئے ممدوح کا کلام ضروری سمجھتے ہیں لہذا انکی ایک پرانی نظم سے آئینہ کے پہلے نمبر کی آرائش کیجاتی ہے۔

لسان العصر مولانا اکبر مرحوم کی وہ غیر مطبوعہ غزل جس سے آئینہ کی پہلی اشاعت کو زینت دی گئی ہے، ممکن ہے کسی رسالہ یا گلدستہ میں شائع ہو چکی ہو لیکن ہمکو یقین ہے کہ انکے کلیات کے کسی حصے میں موجود نہیں۔ آئندہ انشاءاللہ ہم مولانا مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام، جو ہمارے پاس محفوظ ہے، آئینہ کی مختلف اشاعتوں میں وقتاً فوقتاً اپنے ناظرین کی دلچسپی اور ضیافت طبع کے لئے شائع کرتے رہیں گے۔

مرزا غالب مرحوم کی وہ غیر مطبوعہ غزل جسکا مقطع یہ ہے۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد ؎ ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

ہمارے ایک معزز دوست نے خاص "آئینہ" کے لئے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کی بیاض سے نقل کر کے ہمکو اشاعت کے لئے بھیجی۔ لیکن ہم اسکی اشاعت کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ہمارے ایک مقتدر معاصر نے اپنی مارچ و اپریل کی متحدہ اشاعت میں یہ غزل شائع کردی۔ ہم معاصر موصوف کی خدمت میں اس سبقت پر اپنی دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

افسوس ہے کہ "آئینہ" عالم وجود میں آنے سے پہلے ہی قوم کا ایک بیش قیمت ہیرا کھو بیٹھا! مولوی سید فخر اللہ صاحب مرحوم جو علاوہ ایک زبردست انشا پرداز اور متعدد کتب تواریخ کے مصنف ہونے کے ایک نہایت اعلیٰ صفات سے متصف بزرگ تھے۔ یکایک سرسام کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر جاں بحق تسلیم ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور انکے لائق فرزند اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مقام مسرت ہے کہ ہمارے عزیز و محترم دوست حکیم سید منصور علی صاحب جنکو آئینہ سے خاص دلچسپی ہے ایک نہایت طویل و مہلک بیماری سے صحتیاب ہو کر آجکل کوہ مسوری میں زینت فزا ہیں۔ ہم اپنی اور آئینہ کی طرف سے اس مبارک موقعہ پر اظہار تہنیت کرتے ہیں۔

ہمارے عزیز گرامی قدر سید حمید اللہ ایک مضمون "عرب کے دو غلام عاشق" کے عنوان سے لکھ رہے ہیں۔ اگر انکی دلچسپ مصروفیتیں مانع نہ آئیں تو ہم غالباً اس مضمون کو آئینہ کی تیسری اشاعت میں شائع کر سکیں گے۔

آخر میں۔ میں ان تمام معاونین کرام کا تہ دل سے ممنون ہوں جنکی گراں قدر امداد کے بغیر رسالہ کا عالم وجود میں آنا ممکن نہ تھا۔ اس ضمن میں میرے محترم عنایت فرما مولوی علی امیر صاحب ایم۔ اے پروفیسر کوئنس کالج بنارس۔ نواب سید محمد عیسیٰ صاحب۔ خان بہادر حاجی محمد عبدالباقی خان صاحب حکیم سید منصور علی صاحب۔ سید ماجد علی صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی منشی مسیح اللہ صاحب۔ سید ابوالحق صاحب بیرسٹر۔ میر سجاد علی صاحب وکیل کنور سرجو پرشاد صاحب۔ بابو رادھے شیام صاحب آنریری مجسٹریٹ میرے خاص شکریہ کے مستحق ہیں۔ میں اپنے محترم بزرگ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب قبلہ مدظلہ العالی کا بھی شکر گذار ہوں کہ ممدوح نے باوجود کثرت مشاغل۔ "آئینہ" کی مستقل مضمون نگاری قبول فرما کر مجھے فخر و مباہات کا موقع دیا۔

"اڈیٹر"

شکسپیر

(از علامہ سر محمد اقبال - ایم - اے - پی - ایچ - ڈی)

شفق صبح کو دریا کا خرام آئینہ
نغمۂ شام کو خاموشیٔ شام آئینہ

برگِ گل آئینۂ عارضِ زیبائے بہار
شاہدِ گل کے لئے حجلۂ جام آئینہ

حسن آئینۂ خلق اور دل آئینۂ حسن
دلِ انسان کو ترا حسن کلام آئینہ

ہے تری فکر فلک رس سے کمالِ ہستی
کیا تری فطرت روشن ہے مآلِ ہستی

جب تجھے دیدۂ دیدار طلب نے ڈھونڈا
تاب خورشید کو خورشید میں پنہاں دیکھا

چشم عالم سے تو ہستی رہی مستور تری
اور عالم کو تری آنکھ نے عریاں دیکھا

حفظ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا

رازداں پھر نہ کریگی کوئی پیدا ایسا

آئینہ

سارے ہندوستان کی ایک زبان

کیا اُردو اور ہندی دو زبانیں ہیں

(سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب۔ بی۔ اے۔ ال۔ ٹی۔ اُردو لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی کے قلم سے)

ہندوستان کا ملک ایک نمائش گاہ ہے کہ طرح طرح کا آدمی رنگ رنگ کی بولی بول رہا ہے۔ نسل ہو یا قومیت مذہب ہو یا معاشرت۔ کسی بات میں ایک سے ایک نہیں ملتا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ چپے چپے کی زبان جُدا ہے۔ ایک قطعے کا آدمی دوسرے قطعے کے آدمی سے ملتا ہے تو ایک دوسرے کا مُنہ دیکھتا ہے۔ نہ اپنی کہہ سکتا ہے۔ نہ دوسروں کی سمجھ سکتا ہے۔ جب حال یہ ہو تو خیال میں یکرنگی کہاں۔ یہی وجہ ہے کہ سارا مُلک ایک دل ہو کر کسی کام میں نہیں لگتا۔ ایک کہتا ہے آم دوسرا کہتا ہے املی۔ ایک جاتا ہے پورب دوسرا جاتا ہے پچھم۔ کہاں کا اتحاد کیسی قومیت اور کس کی ترقی! مُلک کے بہی خواہوں نے جب یہ حال دیکھا تو اُنھیں دُھن ہوئی کہ کسی ایک زبان کو مُلک بھر میں پھیلائیں اور باغ ہند کے بکھرے ہوئے رنگ برنگ پھولوں کو ایک لڑی میں گوندھ کر "بھارت ماتا" کے گلے کا ہار بنائیں۔ اُنھوں نے تجربے سے پوچھا کہ کون ایسی زبان ہے جسے سب سے زیادہ لوگ سمجھتے ہوں اور تھوڑی سی کوشش سے سارا مُلک سمجھنے لگے۔ جواب میں اس نے کسی سے کہہ دیا "اردو" اور کسی سے "ہندی" عقل حیران تھی کہ ایک سوال کے دو جواب کیسے۔ غور کرتے کرتے آخر یہ گتھی سُلجھ گئی اور تجربے کی بات ٹھیک نکلی۔ ہے یوں کہ اُردو اور ہندی ایک ہی بولی کے دو نام ہیں۔ یہ دو الگ الگ زبانیں نہیں ہیں اس لئے کہ دونوں کی صرف و نحو میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

مصدر دونوں میں ایک ہیں۔ اشتقاق کے قاعدے یکساں ہیں۔ جملوں میں لفظوں کی ترتیب ایک ہے۔ تاکید وغیرہ کے طریقے یکساں ہیں۔ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لفظ ایسے ہیں جو اُردو میں بھی ہیں اور ہندی میں بھی۔ اچھا ان باتوں کو بھی جانے دو۔ ہندی کے حمایتی کہتے ہیں کہ عربی فارسی ملی ہوئی ہندی اُردو ہے۔ اُردو کے طرفداروں کا قول ہے کہ سنسکرت ملی ہوئی اُردو کو ہندی کہتے ہیں۔ ان دعووں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ حقیقت میں اُردو اور ہندی ایک ہیں صرف نام کا ایر پھیر ہے۔ یورپ والوں کی تیز نگاہیں پہلے ہی اس راز تک پہنچ گئی تھیں۔ انھوں نے دونوں کا نام "ہندوستانی" رکھ کر یہ جھگڑا چکانا چاہا تھا مگر نام بدلنے سے کام نہ چلا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ اگر حقیقت میں اُردو اور ہندی میں کچھ فرق ہو تو اُسے ظاہر کریں اور اُسے مٹانے کی تدبیر نکالیں۔

پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اُردو کے زور پکڑنے سے پہلے شمالی ہندوستان میں برج بھاشا کا راج تھا۔ مہاتما تلسی داس کی بےنظیر کتاب "رام چرت مانس" جو دُنیا میں رامائن کے نام سے مشہور ہے اسی زبان میں ہے۔ یہ اکبری عہد میں لکھی گئی تھی مگر آج بھی شاعری اسے آنکھوں سے لگاتی ہے اور عقیدت اسے پوجتی ہے۔ میں اس مقدس کتاب سے کچھ چوپائیاں سناتا ہوں اور برج بھاشا کا نمونہ دکھاتا ہوں (رامائن کی عبارت جلی حرفوں میں ہے۔ ہر لفظ کے نیچے اس کا اُردو ترجمہ ہے) سیتاجی کے باپ راجہ جنک نے عہد کیا تھا کہ جس کسی میں اتنی طاقت ہو کہ وہ شیوجی کی کمان چڑھا دے اس کے ساتھ اپنی بیٹی کا بیاہ رچائینگے۔ سوئمبر کیا گیا۔ دُور دُور سے راجہ مہاراجہ اپنا زور اور اپنی قسمت آزمائی کے لئے آئے مگر کوئی اس کمان کو اپنی جگہ سے سرکا بھی نہ سکا۔ یہ دیکھکر راجہ جنک نے ان سب کو مخاطب کرکے کہا:۔

کہو کاہے یہ لابھ نہ بھاوا — **کاہو نہ شنکر چاپ چڑھاوا**
کہو کسی کو یہ نفع نہ بھایا — کسی نے نہ شنکر (کی) کمان چڑھائی

رہا چڑھاوب توڑب بھائی — **تل بھر بھومی نہ سکیو چھڑائی**
رہا چڑھانا توڑنا بھائی — تل بھر زمین نہ سکے چھڑا

تجہو آش نج نج گرہ جاہو — **لکھا نہ بدھی بیدیہی بیاہو**
چھوڑو آس اپنے اپنے گھر جاؤ — لکھا نہ خدا (نے) بیدیہی (کا) بیاہ

---

(۱) شنکر۔ شیوجی کا دوسرا نام ہے۔ (۲) بیدیہی۔ سیتاجی کا دوسرا نام ہے۔

جو جنتیؤں بن بھٹ مہی بھائی   تو پُرن کر کرتیؤں نہ ہنسائی
جو جانتا ئیں بے بہادر زمین (کو) بھائی   تو عہد کر (کے) کرتا میں نہ ہنسی

جنک بچن سُن سب نر ناری   دیکھ جانکی[1] بھئے دکھاری
جنک (کے) لفظ سُن (کے) سب مرد عورتیں   دیکھ (کے) جانکی (کو) ہوئے رنجیدہ

اس مجمع میں رام اور لچھمن بھی موجود تھے۔ جنک کی باتیں لچھمن کو بُری لگیں۔ بھائی کے قدموں پر سر رکھ کر کہا

رگھوبنسن میں جہاں کوؤ ہوئی   تہی سماج اس کہے نہ کوئی
رگھوبنسیوں[2] میں جہاں کوئی ہو   اس محفل (میں) ایسا کہے نہ کوئی

آپ کی موجودگی میں ایسے الفاظ کہنا جنک کے لئے مناسب نہ تھا۔ آپ تو آپ اگر حکم ہو تو میں زمین کو گیند کی طرح اٹھالوں اور

کاچے گھٹ جمِ ڈارون پھوری   سکوں میرو مُولک اِو توری
کچے گھڑے کی طرح ڈالوں پھوڑ   سکوں پہاڑ مولی کی طرح توڑ

اس پُرانی کمان کی کیا ہستی۔ اگر اجازت ہو تو

کمل نال اِم چاپ چڑھاؤں   شت یوجن تیر مان لے دھاؤں
کنول (کی) ڈنڈی کی طرح کمان چڑھاؤں   سَو یوجن[3] آسانی سے لے (کر) دوڑوں

ککرمتے کی ڈنڈی کی طرح اسے توڑ ڈالوں اور اگر ایسا نہ کرسکوں تو آقا کے قدموں کی قسم میں پھر کمان ہاتھ میں نہ لونگا۔

لکھن سکوپ بچن جب بولے   ڈگمگانی مہی ڈگج ڈولے
لچھمن غصّے بھرے ہوئے لفظ جب بولے   ڈگمگائی زمین ڈگج[4] ہلے

یہ تھی برج بھاشا یا پُرانی ہندی۔ ظاہر ہے کہ آج کل کے شریف ہندو ہوں یا مسلمان اس زبان میں بات چیت

---

[1] جانکی بھی سیتا جی ہی کو کہتے ہیں۔ [2] رام و لچھمن رگھوبنسی خاندان کے چھتری تھے۔ [3] یوجن آٹھ میل کے برابر ہوتا ہے۔
[4] ڈگج وہ چار ہاتھی ہیں جن پر ہندوؤں کے اعتقاد میں زمین قائم ہے۔

نہیں کرتے ہیں اور ہندی کے پجاری بھی اس زبان کو تمام
ہندوستان کی زبان بنانا نہیں چاہتے ہیں۔ آجکل جس ہندی
کا زور ہے اُسے "کھڑی بولی" کہتے ہیں۔ اس مضمون میں جہاں
کہیں ہندی کا لفظ آئیگا اُس سے یہی کھڑی بولی مُراد ہوگی۔
اب آجکل کی ہندی کا نمونہ دیکھئے۔

اِس وقت "ورتمان" اخبار کا ۱۵ اکتوبر کا پرچہ میرے
سامنے ہے۔ اس کی عبارت دو مقاموں سے نقل کرتا ہوں مشکل
لفظوں کے معنی اُن کے سامنے بریکیٹ میں لکھ دئے ہیں۔

(۱) کانپور کے بازار میں جو ولایتی مال آگیا ہے اُس کا کوئی خریدار
نظر نہیں آتا۔ اگر منیجر والے بٹہ کاٹ کر واپس کر لیں تو بڑی
کرپا (مہربانی) ہو۔ کانپور والے ایسی ہی ایک درخواست
لکھ کر بھیجنے والے ہیں۔

(۲) "سکھ جات (ذات) نے ثابت کر دیا کہ پرتگیہ (عہد) کر کے
اُسے اِس پرکار (طرح) نبھایا (نباہا) جاتا ہے۔ اپنا بلدان
دے کر اپنے ادھکار (حقوق) اس پرکار (طرح) پراپت
(حاصل) کئے جاتے ہیں۔ حقوق حاصل کرنے میں قربانی اس
طرح دی جاتی ہے .... سرکار اب گرودوار کے جھگڑے
نپٹانے کے لئے ایک بل (BILL) بنانے والی ہے جہانتک
اس بل کے حالات ابھی تک پرکاشت (شائع) ہو چکے ہیں
اُن سے پتہ چلتا ہے کہ گرودوارا بل سکھوں کی ساری آشاؤں
(اُمیدوں) پر پانی پھیرنے والا ہوگا .... اِس بل کا
ایک اور دوش (نقص) ہے اور وہ یہ ہے کہ اُس کے تینوں
ممبروں کو تنخواہ سرکار دے گی۔ سرکار سے تنخواہ پانے والے آدمی سے
اس بات کا بسواس (یقین) رکھنا کہ وہ اُس موقع پر بھی سکھوں
کی بھلائی کریگا جس سمئے (وقت) گورنمنٹ کے بھئے (خوف)
اور سکھوں کے فائدے کا پرشن (سوال) اُپستھت
(پیدا) ہوگا بِرتھک (فضول) ہے ہم برابر دیکھتے ہیں
کہ سرکار سے تنخواہ پانے یا منسٹر بننے کے بعد لوگوں کو
ماڈریٹ (MODERATE) بھاؤں تک سے استعفا
دے دینا پڑا ہے .... کیسے آشا (اُمید) کریں کہ
اتنی زبردست بہادر اور اپنے دھارمک (مذہبی) سدھانتوں
(اصول) کے سامنے پرانوں (جانوں) کو بھی کچھ نہ سمجھنے والی
جات (ذات) کے فائدے کے مقابلے میں وے (وہ) اپنی
تنخواہ تتھا (اور) سرکار کے رُعب داب کی تنک (ذرا) بھی
پروا نہ کرینگے۔"

اس پرچے میں سیتلا پرشاد وشنوئی کی ایک نظم بھی چھپی ہے
اس کے ابتدائی دو شعر لکھتا ہوں

ابرو میں خم ہے آنکھوں میں حرکت غرور کی   کیا جانئے موت آئی ہے کس بے قصور کی
حُبِ وطن کی مے سے ہوں خوب مست ہوا   حاجت نہیں مجھے ہے شرابِ طہور کی

اسی اخبار کے ۱۸ اکتوبر کے پرچے میں راجہ رام جیسوال کی
ایک نظم ہے اس کے بھی دو شعر سُن لیجئے۔

نیچے سبھیتہ کی آجکل جو بہی ہے   اُنیوگ دھارا پربل (زوردار) ہو رہی ہے

اکالی توڑتے نہیں کال سے بھی گورنمنٹ کیوں بے عقل ہو رہی ہے

اب تو اُردو، ہندی کا فرق سمجھ میں آگیا ہوگا حقیقت میں دونوں زبانیں بالکل ایک ہیں اگر کچھ فرق ہے تو یہ کہ

(۱) اُردو میں فارسی عربی کے لفظ زیادہ ہیں سنسکرت لفظ کم ہیں اور جو ہیں بھی ان کی صورت کچھ نہ کچھ بدل گئی ہے ہندی میں اس کا اُلٹا ہے۔ فارسی عربی کے لفظ کم اور سنسکرت کے زیادہ ہیں اور ان میں سے اکثر اپنی اصل شکل میں ہیں (اُن لفظوں کا ذکر نہیں جو دونوں زبانوں میں مشترک ہیں)۔

(۲) محاورے۔ کہاوتیں تمثیلیں وغیرہ اُردو میں زیادہ تر فارسی اور کچھ عربی سے ترجمہ ہو کر آئیں اور ہندی میں زیادہ تر سنسکرت سے۔

(۳) اُردو لکھنے والوں کو جب کسی خیال کے لئے بول چال کی زبان میں کوئی لفظ نہیں ملتا تو وہ فارسی یا عربی لفظ لکھ دیتے ہیں۔ ہندی لکھنے والے ایسے موقعوں پر سنسکرت لفظوں سے کام چلاتے ہیں۔

(۴) اُردو میں علمی اصطلاحیں عربی فارسی سے لیتے ہیں اور ہندی میں سنسکرت سے۔

(۵) اُردو میں جب عبارت کو بہت شاندار بنانا یا اپنی قابلیت دکھانا چاہتے ہیں تو عربی لفظ فارسی ترکیبیں اور عربی فارسی کے شعر اور کہاوتیں وغیرہ نقل کرتے ہیں اور ہندی میں سنسکرت سے مدد لیتے ہیں۔

(۶) اُردو میں استعارے تشبیہیں۔ تلمیحیں وغیرہ عربی اور فارسی ادبیات سے لی گئی ہیں اور ہندی میں سنسکرت لٹریچر سے۔

(۷) اُردو شاعری میں فارسی کا عروض مستعمل ہے اور ہندی شاعری میں سنسکرت کا۔

(۸) اُردو فارسی حرفوں میں لکھی جاتی ہے اور ہندی ناگری حرفوں میں۔ یہی سب سے زیادہ کھلا ہوا فرق ہے۔

اُردو اور ہندی میں جو جو اختلافات ہیں وہ ترتیب وار بیان کردئے گئے۔ اب اُسی سلسلے سے ان اختلافوں کے دور کرنے کی تدبیریں جو میرے سمجھ میں آئی ہیں بیان کرتا ہوں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر تدبیر پر فوراً حرف بہ حرف عمل شروع کردیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص ان باتوں پر دھیان رکھے اور جہاں تک ہوسکے ان پر عمل کرے۔ رفتہ رفتہ ایک مدت کے بعد وہ دن بھی آجائیگا کہ یہ دونوں زبانیں مل کر ایک ہوجائینگی۔

(۱) جب ایک ہی بات کے لئے دو لفظیں ملیں تو اُسے ترجیح دی جائے جسے زیادہ آدمی بغیر سمجھائے ہوئے سمجھ سکتے ہوں اس کا ذرا بھی خیال نہ کیا جائے کہ وہ لفظ عربی ہے یا فارسی۔ سنسکرت ہے یا پراکرت۔ دوسرے اگر لوگ "عام طور" پر کسی لفظ کا غلط تلفظ کرنے لگے ہوں تو اس کو صحیح کرنے کی کوشش نہ کیجائے۔ میری مُراد ایسے لفظوں سے ہے جیسے کھیت۔ برات۔ پھاگن۔ نوج۔ نباہ۔ سُنار۔ چاند۔ لالٹیں۔ اَرْدَلی۔ کہ اصل میں "کشیتر" بریاترا۔ پھالگن (نون غنہ)۔ نعوذ۔ نِرباہ۔ سوَرن کار (نون غنہ) چندر۔ لینٹرن۔ آرڈرلی۔ ہیں۔ اسی طرح اگر لوگ عام طور پر

کسی لفظ سے وہ معنی مُراد لینے لگیں گے جس کے لئے وہ لفظ بنایا نہیں گیا تھا تو ہم کو وہی عام فہم معنی مُراد لینا چاہئے۔ مثلاً تکرار کے معنی جھگڑا۔ روزگار کے معنی نوکری یا پیشہ۔ خفیف کے معنی شرمندہ۔ غرور کے معنی گھمنڈ۔ قضا کے معنی موت عطار کے معنی دوا فروش۔ حجّام کے معنی نائی ہی لینا چاہیے گو کہ عربی اور فارسی میں ان لفظوں کے معنی کچھ اور ہیں۔

(۲) جو محاورے چشلیں۔ کہاوتیں لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گئی ہیں اُنھیں سب لوگ استعمال کریں اور اُن کے محاوروں وغیرہ سے پرہیز کریں جن کا سمجھنے والا سو میں ایک آدمی ہو۔

(۳) نئے خیال اکثر نئی چیزیں دیکھنے یا نئی زبان سیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کسی خیال کے لئے ہمارے پاس لفظ نہ ہو تو ہمیں نہ سنسکرت کی طرف دوڑنا چاہئے نہ عربی فارسی کی طرف۔ پہلے ہمیں ہندوستان کی دوسری زبانوں کو ٹٹولنا چاہئے اور جہاں کہیں ہمارے کام کا لفظ ملے اُسے لے لینا چاہئے۔ اس ذریعے سے اُردو ہندی اور ان کی دوسری بہنوں میں میل جول بھی بڑھتا رہیگا اور ہماری زبان کو تمام ہندوستان کی زبان بننے میں زیادہ آسانی ہوگی۔ اگر ہندوستانی زبانوں کا خزانہ اُس لفظ سے خالی ہو تو جس ملک سے وہ نئی چیز آئی ہے یا جس زبان نے وہ نیا خیال ہمارے دل میں پیدا کیا ہے اُسی سے ہم لفظ بھی لے لیں۔ اب اگر ایک بات کے لئے کئی کئی لفظ آ جائیں تو کچھ دن کے بعد دیکھنا چاہیئے کہ کون سا لفظ سب سے زیادہ رواج پا گیا ہے اور اُس کو اختیار کر لینا چاہئے۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ نئی چیز ہمیں نے بنائی ہو یا وہ نیا خیال ہمارے ہی دل میں پیدا ہوا ہو۔ ایسی حالت میں ہم کو ایک نیا لفظ بھی گڑھ لینا چاہئے یہ اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ ہم عربی یا سنسکرت کا ایک نہایت مشکل لفظ ڈھونڈھ لائیں اور اُسے کسی خاص مفہوم کے لئے استعمال کرنے لگیں مگر کسی دوسری زبان سے لفظ لینے یا نیا لفظ گڑھنے میں یہ خیال ضرور رکھنا چاہئے کہ اُس کی آواز ہماری زبان کے لفظوں سے ملتی جلتی ہوئی ہو اور اگر ضرورت ہو تو اُس کی صورت میں ایسی تبدیلی کر دیں کہ جب وہ ہمارے لفظوں کے صف میں بیٹھے تو اجنبی نہ معلوم ہو۔

(۴) اس اختلاف کو مٹانے کی وہی تدبیر ہے جو ہم نے ابھی بیان کی۔ ہماری خاص غرض یہ ہے کہ نہ اُردو لکھنے والے صرف عربی و فارسی ہی سے ہمیشہ مدد لیں اور نہ ہندی لکھنے والے صرف سنسکرت ہی سے۔ نہ اُنھیں سنسکرت سے "اسہیوگ" کرنا چاہئے اور نہ اُنہیں عربی و فارسی سے "ترک موالات"۔

(۵) جو لوگ صحیح ذوق رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ مشکل لفظوں اور مشکل ترکیبوں کی بھرمار سے نہ عبارت کی شان بڑھتی ہے نہ لکھنے والے کی قابلیت ظاہر ہوتی ہے۔ عربی فارسی یا سنسکرت کے لفظ اور فقرے لکھ دینے سے اُردو یا ہندی کی واقفیت کیسے ثابت ہوگی! جن لوگوں کو عربی فارسی یا سنسکرت میں قابلیت کا دعویٰ ہو وہ انہیں زبانوں میں اپنے قلم کا زور دکھائیں۔

بیچاری اُردو یا ہندی کو کیوں تکلیف دیتے ہیں ۔ زبان کی سب سے
بڑی خوبی یہ ہے کہ آسان سے آسان لفظوں میں مشکل سے مشکل
اور نازک سے نازک مطلب ادا کر دیا جائے ۔ اب رہا اپنی زبان
میں دوسری زبانوں کی کہاوتیں مثلیں اور شعر وغیرہ نقل کرنا
تو جیسی عربی ویسی فارسی جیسی سنسکرت ویسی پراکرت ۔ بلکہ آپ
کا جی چاہے تو انگریزی و فرانسیسی ۔ لاطینی و جرمنی ۔ عبرانی و
سریانی ۔ چینی و جاپانی عبارت بھی نقل کیجئے ۔ مطلب صرف وہی
سمجھیں گے جو ان زبانوں سے واقف ہیں ۔ ہاں یہاں میں
پھر کہونگا کہ اُردو کے لئے عربی و فارسی اور ہندی کے لئے سنسکرت
کو مخصوص کر دینا ٹھیک نہیں ۔ اُردو میں سنسکرت کے قول نقل
کیجئے اور ہندی میں عربی و فارسی کے ۔

(۶) استعارہ ۔ تشبیہ ۔ تلمیح وغیرہ زبان کے زیور ہیں ۔ اس
طرح کا سامان جتنا زیادہ ہوگا اتنی ہی زبان میں خوبصورتی ۔ توضیح
اختصار اور ادائے مطلب کی قابلیت بڑھ جائیگی ۔ اسلئے میری
رائے ہے کہ جو تشبیہیں اور استعارے وغیرہ اب تک اُردو سے
مخصوص ہیں ۔ ہندی والے بھی اپنے یہاں رواج دیں اور
جو ہندی سے مخصوص ہیں وہ اُردو میں لائے جائیں ۔ اس طرح
دونوں زبانوں میں کچھ خوبیاں بھی بڑھ جائینگی اور یہ اختلاف
بھی رفتہ رفتہ دور ہو جائیگا ۔

(۷) عروض کے متعلق مجھے کچھ کہنے کا حق نہیں ہے ۔ نہ
میں اُردو کے عروض سے بخوبی آگاہ ہوں اور نہ ہندی
"پنگل" سے واقف ۔ البتہ اُردو اور ہندی نظموں کے مطالعے سے
ایک بات سمجھ میں آئی ہے اُسے کہے دیتا ہوں ۔ میری رائے میں
اُردو میں ہندی کی وہ بحریں لانا چاہیئے جن میں روانی کے
ساتھ شعر موزوں ہو سکتے ہوں اور ہندی "کویوں" کو اُردو کی
بحروں سے پرہیز نہ کرنا چاہیئے ۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ "کھڑی بولی"
کی شاعری کے لئے اُردو کی بحریں پُرانی ہندی بحروں سے زیادہ
موزوں ہیں ۔ میرے اس بیان کا ثبوت یہ ہے کہ آج کل
"کھڑی بولی" کی جو نظمیں پُرانی ہندی بحروں میں کہی گئی ہیں وہ
کتنی بے مزہ اور روکھی پھیکی ہیں ۔ تعقید کا عیب اُن میں قدم
قدم پر موجود ہے اور روانی اور اثر نام کو نہیں ہے ۔ ہندی کے
بعض شاعروں نے یہ راز سمجھ لیا ہے اور اپنی روش بدل دی ہے ۔

خلاصہ اس تحریر کا یہ ہے کہ اُردو لکھو تو کوشش کرو کہ
تمہارا مطلب ہندی جاننے والے بھی سمجھ سکیں اور ہندی لکھو
تو وہ زبان اختیار کرو جو اُردو جاننے والوں کے لئے بھی مشکل
نہ ہو ۔ اُردو ہندی کے مل کر ایک ہو جانے کی سب سے بہتر
تدبیر یہی ہے ۔ یہ نکتہ بھی یاد رکھو کہ جو بولتے ہو وہی لکھو ۔ کسی
مصنوعی زبان کو رواج دینا فطرت سے لڑنا ہے ۔

(۸) حروف کا فرق اصل میں سب سے بڑا فرق ہے میری
رائے میں ہر شخص کو فارسی اور ناگری دونوں طرح کے حرف
سیکھنا چاہیئے کہ اُردو عبارت بھی پڑھ سکے اور ہندی بھی ۔ رہا لکھنا
اس میں اختیار ہے جس کا جی چاہے فارسی حرفوں میں لکھے جس کا

جی چاہے ناگری حرفوں میں لکھے ۔ میں خود فارسی حروف پسند کرتا ہوں ۔ اس لئے اُردو کی موجودہ تحریر پر جو اعتراض کئے گئے ہیں اُن پر ایک نظر ڈالنا چاہتا ہوں ۔ ناگری حرفوں کے طرفدار فارسی تحریر میں یہ نقص نکالتے ہیں کہ اس میں ایک ہی لفظ کو کئی طرح پڑھ سکتے ہیں ۔ ظاہر میں یہ اعتراض بہت وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا وزن بہت گھٹ جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حقیقت میں یہ وقت بہت کم پیش آتی ہے ۔ اتنی کم کہ الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتی ہے ۔ ممکن ہے کہ اگر تنہا ایک لفظ یا ایک فقرہ کہیں لکھا ہو تو اس کے پڑھنے میں کبھی غلطی ہو جائے مگر بالعموم لفظ کسی جملے میں اور فقرہ کسی عبارت میں ہوتا ہے اور اُس لفظ کے گرد وپیش کے لفظ اور اس فقرے کے آس پاس کے فقرے اس کے پڑھنے میں مدد دیتے ہیں ۔ ایک بات اور بھی ہے جسے میں ایک مثال دیکر سمجھاؤنگا ۔ فرض کیجئے کہ کہیں لفظ "خط" لکھا ہوا ہے ۔ اسے تین طرح پر پڑھ سکتے ہیں خط ۔ خِط ۔ خُط ۔ مگر "خِط" اور "خُط" سے ہمارے کان آشنا نہیں ۔ اور "خط" پہلے سے ہمارے ذہن میں موجود ہے اس لئے جہاں کہیں ہم "خط" لکھا ہوا دیکھینگے اُسے بلا تامل "خط" پڑھینگے ۔ اگر کبھی ہمارا ذہن بھٹک کر "خِط" یا "خُط" کی طرف چلا جاتا ہے تو یہ خیال کہ ہماری زبان میں "خِط" یا "خُط" کوئی لفظ نہیں ہے اُسے سیدھے راستے پر لگا دیتا ہے ۔ پھر اگر لفظوں پر نقطے اور اعراب لگا دئے جائیں تو الگ الگ لفظوں کے پڑھنے میں بھی کبھی غلطی نہیں ہو سکتی ۔ اب رہا خط شکست وہ ناگری تحریر میں بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا فارسی تحریر میں ۔ اس کے پڑھنے کے لئے دونوں صورتوں میں کافی مشق اور مہارت کی ضرورت ہے ۔ اس کے علاوہ میرا تو خیال ہے کہ اُردو کی اُس تحریر کا جس پر اعراب نہ لگے ہوں ناگری سے نہیں کیتھی سے مقابلہ کرنا چاہئے ۔ کیونکہ کیتھی اصل میں بے اعراب کی ناگری تحریر ہے ۔ جس طرح عجلت کے خیال سے کیتھی میں پائی اور ماترا وغیرہ نہیں لگاتے ہیں اسی طرح اُردو میں زیر ۔ زبر ۔ پیش وغیرہ نہیں دیتے ۔ اور جس طرح کیتھی کو بغیر پائی اور ماترے کے صرف قرینے سے صحیح پڑھ سکتے ہیں اسی طرح اُردو کو بغیر اعراب کے ۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ غلطی کا احتمال کیتھی میں اُردو سے کہیں زیادہ ہے ۔ اگر بغیر اعراب کے اُردو میں ایک لفظ پانچ طرح پر پڑھا جا سکتا ہے تو کیتھی میں دس طرح پر ۔

اُردو کی تحریر پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اُس کا سیکھنا مشکل ہے ۔ یہ سچ ہے ۔ کہ ہندی لکھنا اُردو لکھنے سے جلد آجاتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ معمولی آدمی ہندی لکھنا تین دن میں اور اُردو لکھنا ایک ہفتے میں سیکھ سکتا ہے ۔ لیکن اب ذرا اس بات پر دل نظر کرو کہ اگر ایک آدمی بیس برس تک برابر اُردو حرفوں میں لکھتا رہے اور دوسرا ہندی حرفوں میں تو کون کتنا زیادہ لکھ ڈالیگا اور سچ کہو کہ ابتدا میں جو چار دن کا نقصان ہوا تھا اس نے بدلے میں کتنا نفع ہوگا ۔ ہے یہ کہ اُردو میں لکھنے کا وہ ڈھنگ

اختیار کیا گیا ہے جو مختصر نویسی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ اُس کی
بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ لکھنے میں وقت بھی کم لگتا ہے اور کاغذ
بھی۔ اور کون عقلمند ہوگا جو اس عجلت پسندی اور اقتصادی
کشمکش کے زمانے میں وقت اور کاغذ کی یہ بچت نظر انداز کر دیگا؟
اس مقام پر مجھے یہ بھی بتا دینا چاہئے کہ آجکل کچھ لوگ اُردو رسم الخط
میں ایسی اصلاحیں سوچ رہے ہیں کہ اعراب کی ضرورت ہی
باقی نہ رہے۔ یا اگر رہے تو بہت کم اور جو لکھا گیا ہے اس کے
سوا کچھ اور نہ پڑھا جا سکے۔ جس وقت یہ اصلاحیں مکمل ہو جائینگی
اُس وقت شاید کسی زبان کی تحریر اُردو کی تحریر کا مقابلہ نہ کر سکے۔

حقیقت میں اُردو کی تحریر میں اگر کوئی وقت ہے تو یہ کہ
بعض آوازوں کے لئے کئی کئی حرف استعمال کئے جاتے ہیں۔
ا + ع ۔ ت + ط ۔ س + ث + ص ۔ ز + ذ + ض + ظ ۔
ہ + ح ۔ ان میں سے ہر مجموعے کے حروف اُردو میں ایک ہی
آواز ظاہر کرتے ہیں (عربی کا ذکر نہیں) جن آوازوں کے
لئے ث + ح + ذ + ص + ض + ط + ظ + ع ۔ یہ آٹھ حرف
ایجاد کئے گئے ہیں وہ ہماری زبان میں موجود نہیں ہیں۔ اس لئے
بہ ظاہر یہ فیصلہ بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرف اُردو کے
حروف تہجی سے خارج کر دئے جائیں مگر جہاں تحریر کی آسانی
انھیں نکالنا چاہتی ہے وہاں بعض وجہیں اُن کی سفارش بھی
کرتی ہیں۔ اوّل تو جن لفظوں میں یہ حرف آ جاتے ہیں وہ اپنی
اصل کا پتہ دیتے ہیں اور یہ اتنی بڑی خوبی ہے کہ کوئی علم اللسان
کا ماہر اس کے مقابلے میں تحریر کی آسانی کی کچھ بھی پروا نہ کریگا۔
اُردو کے بعض لفظوں کا اِملا اُن کے تلفّظ کے مطابق نہیں
ہے مثلاً "بالکل" "خواہش" مگر ان میں بھی یہی خوبی موجود ہے۔
دوسرے بہت سے لفظ جو تلفّظ میں یکساں اور معنی میں مختلف
ہیں جب لکھ دئے جاتے ہیں تو اپنے معنی آپ بتاتے ہیں۔ جیسے
ثواب + صواب ۔ نال + نعل ۔ نذیر + نظیر وغیرہ ۔ یہ بھی
ایسی خوبی ہے کہ نظر انداز نہیں کی جا سکتی ہے۔

یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ اُردو کا موجودہ طرزِ
تحریر وہ ہے جو بہت خفیف سے تغیر کے ساتھ ایشیا کے کئی ملکوں
یورپ کے بعض خطوں اور افریقہ کے زیادہ حصّے میں رائج ہے۔
اس لئے اگر ملک کی مشترکہ زبان کے لئے ہم اسی کو اختیار کرلیں
تو جہاں اُردو زبان ہندوستان کی مختلف قوموں کو ایک کر سکتی
ہے وہاں اُردو کی تحریر بھی مختلف ملکوں سے اتحاد پیدا کرنے کا ایک
ذریعہ بن سکتی ہے۔ یہ ایسی صفت ہے جو ہندوستانی زبانوں میں اُردو
کے سوا کسی کو نصیب نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اتحاد ہی نے اُردو کا بیج بویا۔
اتحاد ہی نے اسے سینچا۔ اتحاد ہی کی ہوا میں یہ پودا پنپا۔ پھولا پھلا
اور ایک چھتنار درخت ہوگیا۔ اس کے سائے میں اتحاد کی کیفیت ہے
اس کی ہوا میں اتحاد کا اثر ہے اور اب بھی اُسے سرسبز رکھنے کے لئے
اتحاد ہی کی آبیاری کی ضرورت ہے۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ بی۔ اے۔ ال۔ ٹی
اُردو لکچرر۔ لکھنؤ یونیورسٹی

"لمعات اکبر"

(لسان العصر مولانا اکبر مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام)

غم میں ہو جاتا ہی ہے امید فردا سے سکون — وائے بر حالش جسے اُمید فردا بھی نہ ہو
محترز فریاد سے ہوں زیر لب کرتا ہوں آہ — آپ کی مرضی ہے شاید یہ کہ اتنا بھی نہ ہو
دل کے ٹکڑے کرتی ہے یارب خلش اُمید کی — بر نہیں آتی اگر ظالم تو پیدا بھی نہ ہو
پوچھ پوچھ ہی کر رہ گئے وہ جس کو اس کو ہے گلہ — اس کے دل سے پوچھئے جس کو کہ پوچھا بھی نہ ہو

پیسہ کا سفر نامہ

(اس کی خود بیتی نوشت)

ذیل کا نتیجہ خیز اور عبرت آموز مضمون میرے محترم بزرگ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب قبلہ مدظلہ العالی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ حضرت خواجہ صاحب قبلہ "آئینہ" کے خاص سرپرستوں میں ہیں۔ اور ہمیں اُمید ہے کہ "آئینہ" کا کوئی نمبر آپ کے سحر طراز اور گراں قدر مضامین سے خالی نہ نکلیگا۔ اس مضمون کے ساتھ جو خط موصول ہوا ہے وہ ناظرین "آئینہ" کی دلچسپی کے لئے بجنسہ نقل کیا جاتا ہے۔ اڈیٹر

دہلی۔ ۱۳ار فروری ۲۳ء

مخلص نواز جناب مولوی وحید الدین احمد صاحب۔ سلام علیکم۔ ایک مضمون ارسال خدمت ہے۔ میں یہاں آکر علیل ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے الہ آباد کے متعلق یا "آئینہ" کے حسب مذاق کوئی مضمون نہ لکھ سکا۔ خدا نے چاہا آئندہ پرچوں کے لئے کچھ حاضر کروں گا۔ بالفعل اس کو قبول کیجئے۔

دعاگو۔ حسن نظامی

میں تانبہ کی دوکان میں رہتا تھا اور سفر کا نام بھی نہ جانتا تھا۔ لیکن چند آدمیوں نے مجھ کو میری ماں کی گود سے جُدا کر کے کان سے باہر نکالا اور بھٹی میں لیجا کر گلایا۔ اُف اُف!

کیسی سخت آگ تھی جس نے مجھ کو پتلا پانی کر دیا کچھ دیر کے بعد میرے دو مُنہ بنائے گئے اور اُن پر عربی حروف میں "سلطان محمد تغلق" لکھدیا گیا۔ جب میرا بدن تیار ہو گیا تو کہا گیا اب

مجھ کو سفر کرنا ہوگا۔ میں نے پوچھا کہاں کا جواب ملا جہاں تمام کا یہ کہکر مجھ کو ایک تھیلی میں بند کر کے خزانے میں بھیجدیا گیا وہاں سونے چاندی کے بھائی بھی تھے ان کو بھی میں نے تھیلیوں میں بند دیکھا اور سب کو مغموم پایا تو پوچھا بھائی تم چپ کیوں ہو وہ بولے گھر کی جدائی کا رنج ہے اور اس کا صدمہ کہ آزادی چھن گئی اور دوسروں کے غلام بن گئے۔ میں نے کہا غلامی کہاں ہے تم اب بھی آزاد ہو تمہاری اصل موجود ہے انہوں نے جواب دیا بیشک ہم سونا چاندی ہیں مگر ہیروں پر نقش جو لگائے گئے ہیں وہ غلامی کا نشان ہے اب ہم کو سونا چاندی کوئی نہیں کہے گا اشرفی روپیہ کہکر پکارا جائیگا۔ یہ سنکر مجھ کو بھی خیال ہوا کہ واقعی یہ حالت تو غلامی کی ہے کہ ہیں کچھ اور کہا کچھ اور جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں بادشاہ کا حکم آیا کہ ایک سو ایک اشرفیاں ایک سو ایک روپئے ایک سو ایک پیسے خیرات میں دیدو خزانچی نے ہم کو نکالا اور گن کر دے دیا پیسوں میں میں بھی نکلا اور ایک محتاج کو دیا گیا یہ شخص ہم تینوں کو کپڑوں میں باندھ کر گھر لایا اور صبح سے لیکر دوپہر تک ہم کو سامنے رکھکر دیکھتا اور گنتا رہا اس کے کئی بچے تھے اور وہ سب بھوکے تھے جب وہ بھوک سے رونے لگے تو وہ شخص اٹھا اشرفیاں روپیے تو دفن کر دیے اور پانچ پیسے لیکر بازار گیا اور ایک دوکان سے اس نے پکی ہوئی روٹی خریدی ان پانچ پیسوں میں ایک میں بھی تھا

نان بائی نے مجھ کو لیکر پانی کے پیالے میں ڈبو دیا آدھی رات تک میں غرقِ آب رہا جب نان بائی نے دوکان بڑھائی تو مجھ کو نکال کر ایک تھیلی میں ڈال دیا دوسرے دن صبح کو قصائی گوشت لیکر آیا تو نان بائی نے تھیلی میں سے پیسے، نکال کر اس کو دئیے تو میں بھی اس کے ہاتھ میں گیا وہاں بکریاں بک رہی تھیں وہ اس نے خریدیں اور مجھ کو بکری والوں کے حوالہ کر دیا بکری والے مجھ کو لیکر اپنے گانوں چلے گئے یہ گانوں شہر سے ذرا دور تھا اس بکری والے کی ایک بڑھیا ماں تھی جو اس وقت نماز پڑھ رہی تھی نماز پڑھ چکی تو بکری والے نے مجھ کو اس کے حوالہ کیا اس نے ہاتھ بلند کر کے خدا کا شکرانہ بھیجا اور پانچ پیسے الگ نکال کر رکھ دئیے ان ہی میں ایک میں بھی تھا میں رات بھر اپنے سب بھائیوں سے جُدا صرف چار بھائیوں کے ساتھ کونے میں دھکا رہا صبح کو وہ بڑھیا مجھ کو لیکر حضرت مخدوم نصیرالدین چراغ دہلی کے پاس گئی اور ان کے قدموں میں مجھکو رکھدیا انہوں نے مجھ کو لیکر اپنے داروغۂ لنگر کے حوالہ کر دیا تھوڑی دیر لنگری کی جیب میں رہا، اتنے میں ایک شخص اودھ کا رہنے والا غریب مسافر مخدوم چراغ دہلی کے پاس آیا اور دو ہاتھوں نے لنگری سے پیسے مانگ کر اس مسافر کو دیدئے ان پیسوں میں میں بھی تھا وہ مسافر مجھ کو لیکر اپنے وطن کو چلا اس کے پاس خرچ تھا اس سے ہم پانچوں کو حضرت مخدوم کا تبرک سمجھ کر الگ کر دیا

اور راستہ میں کہیں خرچ نہ کیا لیکن جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اس کا خرچ ختم ہو گیا اور دو وقت کے فاقہ کے بعد ایک سرائے میں اس نے مجھ کو ایک بھٹیاری کے حوالہ کرکے روٹی کھائی اور چلا گیا یہ بھٹیاری بہت کنجوس تھی اس نے مجھ کو گڑھا کھود کر دبا دیا جہاں اور بھی اشرفیاں اور روپے پیسے دفن تھے اس گڑھے میں بیس برس دبا پڑا رہا وہ بھٹیاری مرگئی اور اس کے بیٹے نے کھود کر مجھ کو نکالا اور عیاشی میں خرچ کرنا شروع کیا ایک دن اس نے شراب فروش سے شراب لی اور مجھ کو اس کے سپرد کر دیا کلال مجھ کو لیکر گھر آیا اور بہت روز میں اس کے پاس رہا۔ ایک دن رات کو اس کے یہاں چور آئے اور میں بھی ان کے ہاتھوں چوری ہو کر کمر میں باندھا گیا اور گھوروں پر جنگل در جنگل پھرتا رہا وہ چور رات کو سوتے تھے کہ بادشاہی فوج نے ان کو آن گھیرا اور وہ سب مارے گئے فوجی سپاہیوں نے ان کا اسباب لوٹ لیا اس میں میں بھی تھا مگر رات کے سبب میں زمین پر گر پڑا اور کسی نے مجھ کو نہ دیکھا سپاہی چلے گئے اور مجھ کو زمین پر اکیلا چھوڑ گئے اس جنگل میں مجھ کو سات برس گذر گئے بارش ہوتی تو میں خاک میں دب جاتا آندھی چلتی تو خاک میرے چہرے سے ہٹ جاتی ایک روز گرمی کے موسم میں کوئی سوار اس راستہ سے آیا اور درخت کے نیچے دم لینے بیٹھ گیا اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تو اس نے مجھ کو اٹھا کر کمر میں

باندھ لیا اور اس طرح سات سال کے بعد میں پھر شہر میں آیا۔ یہ سپاہی ہندو تھا اس نے مجھ کو ایک بھاٹ کے حوالہ کر دیا تین دن بعد بھاٹ کی بیوی مرگئی اور اس نے کفن خریدنے میں مجھ کو ایک کپڑے والے کے حوالہ کیا کپڑے والا مسلمان تھا اس نے مجھ کو مدت تک تھیلی میں رکھا اور آخر ایک دن کپڑا بننے والے جلاہے نے مجھ کو اسی دن سوت کاتنے والی عورت کے حوالہ کر دیا اس عورت کا بیٹا سبزی فروش تھا صبح وہ ترکاری خریدنے گیا تو عورت نے مجھ کو بھی اس کو دیدیا اس نے لیجا کر ترکاری کی منڈی میں مجھ کو سبزی فروش کے حوالہ کیا سبزی فروش بڑا عیاش تھا اس نے ایک فاحشہ عورت کو دیدیا فاحشہ عورت نے مجھ کو ایک تھیلی میں بند کر دیا جہاں اور روپے پیسے بھی تھے کچھ دن کے بعد عورت نے ایک صرّاف سے اشرفیاں لیں اور میں روپیوں پیسوں کے ساتھ صرّاف کے گھر پہنچا۔ صرّاف نے مجھ کو دفن کر دیا اور میں چار سو برس برابر زمین میں گزارا کیونکہ صرّاف مرگیا تھا اور اس نے کسی کو اپنے مال کی خبر نہ دی تھی وہ صرّاف پانی پت میں رہتا تھا چار سو سال کے بعد جب نادر شاہ ہندوستان پر چڑھ کر آیا اور پانی پت کے میدان میں محمد شاہ کی فوج سے اس کا مقابلہ ہوا تو زمین ہموار کرنے میں وہ دیگچہ نکل آیا جس میں میں بند تھا چوبداروں نے یہ روپیہ بانٹ لیا اور میں بھی ایک ایرانی چوبدار کے ہاتھ آیا نادر شاہ دہلی پہنچا

چوبداروں نے مجھ کو بازار میں دینا چاہا مگر کسی دوکاندار نے
مجھ کو قبول نہ کیا اور کہا یہ پُرانا سکہ ہے اور اب اس کا چلن
بند ہے مَیں اس کی جیب میں تھا کہ ایک دہلی والے نے چوبدار
کو مار ڈالا اور اس کی جیب میں سے مجھ کو نکال لیا اور اپنے گھر
لے گیا دوسرے دن وہ شخص بھی نادری قتل عام میں مارا گیا
اور اس کے گھر میں آگ لگائی گئی جس میں مَیں بھی جل کر کالا
ہوگیا اور کئی برس جلے ہوئے انبار میں پڑا رہا آخر ایک شخص نے
مکان بنوانا چاہا تو میں ایک بیلدار کو مل گیا اور اس نے مجھ کو
اپنی بیوی کو دیدیا بیوی نے مجھ کو چولھے کے سامنے دفن
کر دیا جہاں اس کے اور بھی روپیے دفن تھے چند روز کے
بعد یہ دونوں میاں بیوی مر گئے اور میں چولھے کے سامنے
سو برس تک دفن رہا اس کے بعد دہلی میں سپاہیوں کا
غدر ہوا اور اس کے فرو ہونے کے بعد دہلی کے بعض محلے
کھودے گئے تو میں بھی کھُد کر نکل آیا اور ایک مسلمان مزدور نے
مجھ کو پایا اس نے چاندی کے سکے تو فروخت کر دئے اور
مجھ کو ایک تعویذ سمجھ کر بچّہ کے گلے میں ڈال دیا کیونکہ اس
نے مجھ پر عربی خط دیکھکر خیال کیا تھا کہ مَیں بہت متبرک
ہوں دس برس تک میں اس کے گلے میں رہا اور جب وہ
بچّہ ہوشیار ہوگیا تو اس نے ایک دن مجھے چنے والے کو
دیکر چنے خرید لئے چنے والے کے پاس مجھ کو ایک لکھے پڑھے
مسلمان نے دیکھا اور ایک روپیہ میں مجھ کو خرید لیا یہ
مسلمان گھر میں آیا اور مجھ کو ہاتھ میں لیکر کہنے لگا اے پیسے! ذرا
مُنہ سے بول تو نے دُنیا میں کیا کیا انقلاب دیکھے تو کہاں کہاں
رہا تجھ پر ایک اسلامی شہنشاہ کا نام کندہ ہے جو بڑا طاقتور
اور شان و شوکت کا جاندار تھا اس کے نام سے تیری عزت
تھی تو اسلامی سکہ کہلاتا تھا مگر آج وہ تیرا مالک خاک میں پڑا
سوتا ہے آج اس کی حکومت کا کہیں نام و نشان بھی نہیں
آہ مَیں اس تغلق کی اولاد ہوں لیکن نامراد و برباد ہوں اب
مسلمانوں کی سلطنت نہیں رہی اب تجھ جیسے حرفوں کا چلن نہیں
رہا اب تو ہم لوگوں کی ایک پُرانی نشانی کہلائیگا اب بازار میں
مٹھی بھر چنے بھی تیرے عوض کوئی نہ دیگا دیکھ یہی ہمارا حال
ہے کہ نسلِ شاہ میں خلف ذی جاہ ہیں مگر انقلاب ایام کے
ہاتھوں تباہ ہیں یہ کہکر وہ مسلمان بہت رویا اور مجھ کو چومتا
رہا آنکھوں سے لگاتا رہا چند روز میں اس کے اس کے پاس
رہا لیکن ایک دن بازار میں اس نے دیکھا کہ ایک امریکن
پُرانے سکّے خرید رہا ہے اور بڑی بڑی قیمتیں ان سکوں کی دے
رہا ہے میرے مالک نے بھی مجھ کو جیب سے نکال کر اس کو
دکھایا امریکن نے میری خرید منظور کر لی اور دس روپے میرے
عوض اس کو دینا چاہے میرا مالک بہت مفلس تھا اس کو
روپیے کی بہت ضرورت تھی مگر اس نے کہا نہیں میں اپنے
مُلک کی یادگار تجھ کو نہ دونگا فاقہ کروں گا اپنے آثارِ قدیم
کو پاس سے جُدا نہ ہونے دونگا امریکن یہ جواب سُنکر چپ

ہوگیا وہاں بہت لوگ کھڑے ہوئے تھے اور اس قصّے کو انھوں نے سُنا تھا جب میرا مالک گھر آنے لگا تو ایک جیب کترے نے مجھ کو مالک کی جیب کتر کے نکال لیا اور اُس امریکن کے پاس لے جاکر فروخت کر ڈالا امریکن مجھ کو لیکر اپنے ملک میں گیا اور ایک عجائب خانہ میں مجھ کو رکھ دیا میں وہاں پانچ برس رکھا رہا اور ہزاروں مردوں اور عورتوں نے آ آ کر مجھ کو دیکھا ایک دن ایک ہندوستانی مسافر بھی وہاں آیا اور اس نے وہاں سے مجھ کو چُرایا اور پھر ہندوستان لیکر آیا اور یورپ کے عجائب خانہ میں فروخت کر دیا آج میں اسی جگہ مقیم ہوں اس کے بعد خبر نہیں کہاں کا سفر پیش آئے لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب میں اپنے وطن میں ہوں جس کی یاد مجھے امریکہ میں ستایا کرتی تھی خدا بھلا کرے اس ہندوستانی کا جس نے اپنا ملکی فرض محسوس کیا۔

حسن نظامی

افکارِ جلیل

(از نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل القدر جناب حافظ جلیل حسن صاحب جلیل)

ثابت کہیں سے بھی نہیں پاتا جگر کو میں — بیدرد کیا کہوں ترے تیر نظر کو میں
سوتے میں کھل گئی ہے جو وہ زلف مشکبو — کیا کیا ملا رہا ہوں نسیم سحر کو میں
سمجھو نہ یہ کہ دل کی طرف سے ہوں بے خبر — تم مجھ کو دیکھتے ہو تمہاری نظر کو میں
دست جنوں نے کھینچ دی تصویر شمع و گل — کرتا ہوں چاک جیب کو دُھنتا ہوں سر کو میں
شاید ابھی وہ دیکھ کے آئے ہیں آئینہ — کہتے ہیں مانتا ہوں تمہاری نظر کو میں
مجھ کو تھی فکر نالۂ دل کی کہ کیا ہوا — آئی ندا کہ ڈھونڈھ رہا ہوں اثر کو میں
قاتل پہ آج کھول رہا ہوں میں دل کا حال — مرنے پہ آج باندھ رہا ہوں کمر کو میں
یا تاک تاک کر مجھے برسائیں تیر آپ — یا اب ترس ترس کے رہوں اک نظر کو میں

اب آپ مجھ سے آنکھ چُراتے ہیں کیوں جلیل
پہچانتا ہوں خوب چھبیلی نظر کو میں

جلیل

حسینوں کی حسین بغاوتیں

(شاہ نذیر صاحب ہاشمی سابق سب اڈیٹر الناظر کے قلم سے)

جب کبھی کوئی عالم سوز جنگ یا عالم گیر طوفان یا ہمہ گیر زلزلہ دُنیا میں آیا ہے تو اُس نے اپنے اثرات، مابعد میں جہاں بھیانک نیستیوں اور خاموش معدومیوں کا سلسلہ چھوڑا ہے۔ وہیں نئی نمو بخش قوتیں، نئی نئی طمعیں اور نئی نئی حیرت افزا طاقتیں بھی انھیں خرابات میں سربلندی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ بعینہ عالم سیاسیات میں جب جب خون آشامی، قید و محن اور دار و رسن کے شکنجوں کی زیادتی ہوئی ہے۔ اس کے بعد فوراً نئے انقلابوں، نئے محشر خیز ہنگاموں، اور آزادیوں کے جذبات قائم بالذات ہوئے ہیں انھیں رنگین نظر آفرینیوں میں دیکھا جاتا ہے کہ یورپ کی جنگ نے دُنیا میں نئی نئی دیوانگیاں اور نئے نئے اسلوب حیات پیدا کر دئے ہیں۔ سب سے زیادہ اس نے قدرت کی حکمتوں اور اسرار پسندیوں کی بہترین مخلوق یعنی عورت کے عالم نامعلوم میں ہلچل ڈالی ہے۔ صرف ایک لندن میں لاکھوں کنواریاں اور سدا سہاگنیں ہیں جنھوں نے جنگی قحط الرجال کے باعث اپنے آپ کو تزویج کا شرمندۂ احسان نہیں بنایا۔ پیرس!

ہاں وہ پیرس جو کنواری دلہنوں کی جنت تھی!!

آج بیواؤں اور کنواری بیواؤں کی ناشگفتہ زندگی سے ایک ماتم سرا بن رہی ہے!! برلن، وائنا، اور ماسکو میں بھی یہی حال ہے کہ عورتیں سنگریزوں کی طرح ماری پھرتی ہیں۔ اُن کے قید و بند کا سوال تو درکنار ان کے قوت لایموت کا دینے والا کوئی نہیں ہے اور اب تو یہ تجویزیں زیر مطالعہ ہیں کہ کس طرح ان عورتوں سے کام لیا جائے؛ کہاں سے مرد لائے جائیں اور کتنی عورتیں ایک وقت میں ایک مرد کے ساتھ رکھی جائیں تا کہ نسل یورپ منقطع نہ ہونے پائے کبھی تعدد ازدواج کی جانب خیال رجوع کیا جاتا ہے اور کبھی اُجرت پسند خاوندوں کی تحریک زیر غور لائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ حرم سرار سلطانی جس کے اسرار اور حکایات کے معلوم کرنے کے لئے مغرب کے عجوبہ نواز شعرا، اور مشہور مصنفین جان دیتے ہیں آج قسطنطنیہ میں انقلابات کے باعث معمولی عورتوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ بمبئی کرانیکل میں جو آج دیار اسلام اور اسلامیوں کا زبردست نقیب اور حمایتی ہے اس کو پڑھ کر رونا آتا ہے کہ پیرس اور امریکہ کے ایوا نہائے رقاص اور تماشہ گاہ کے مالکوں نے ان محترم خواتین سلطانی کو جنھیں معزول سلطان وحید الدین اپنے بعد چھوڑ آئے ہیں اپنے یہاں ملازم رکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے، اور وہ ان سے حسن فروشی اور عجوبہ نمائی

کا کام لیا چاہتے ہیں - یہ ایک عبرت خیز نیرنگئ دہر ہے کہ جن
حورانِ حرم سرائے سلطانی کی حورانہ زندگیوں پر شبنم پردہ پوشی
اور آفتابی شعاعیں نورانیت کا پرتو ڈالا کرتی تھیں اور مغرب
کے شعراء و اربابِ قلم کی جماعت خواب آور تمنائیں اس حرم سرا
کی حسن بیز زندگی کے معلوم کرنے کی کرتی تھیں وہ اس طرح
بے پردہ اور بیکس ہو گئی ہیں کہ ہر کوئی انھیں نیلام کی چیز
سمجھ کر زینت تماشہ گاہ بنانا چاہتا ہے!

یلدیز کوشک، قسطنطنیہ کی بند کتاب حرم سرا، مصر کی
میانی کی طرح ایک عجوبۂ مجسّم تھی - جو آج تلاطم سیاسیہ سے
ایک عریاں و برہنہ عبرت ہے!

بعض سیاحوں نے یورپ کے تازہ سفر سے واپس آکر
بیان کیا ہے کہ نہ صرف عورت کے متعلق یورپ کے خیالات
سیہ کارانہ اور غلامانہ ہیں بلکہ عام طور سے ایک درندگی،
بہیمیت اور شیطنت ہے - جس نے زندگی کی ہر نقل و حرکت
کو متاثر کر رکھا ہے - وہ درسگاہیں، وہ علوم و فنون کے
مرکز اور وہ چرچے تہذیب نفس کے جو پہلے تھے آج نہیں
ہیں - ایک سناٹا سا ہے جو چھایا ہے ایک قیامت خیز
تصادم اقوام ہے جو قریب آ رہا ہے - ہر طرف مجبور اقوام
اور کمزور ممالک کی جانب غضب اور دست برد کی پیش دستیاں ہیں -

قریب الایّام میں ظاہر ہوئے تھے - آج اس طرح ایشیا اور یورپ
میں آویزشیں پیدا ہوتی جا رہی ہیں کہ ان کا صاف ہونا
بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے - حقیقت میں یہ تمام خرابی مردوں
کے نامۂ اعمال میں لکھی جا رہی ہے - بعض مغربی خواتین اپنے
مضامین اور کتابوں میں لکھتی ہیں کہ اگر عورت کے ہاتھ میں
حکومت کی باگ ہوتی تو دنیا میں اس درجہ قتل و غارت گری
اور پریشانی نہ ہوتی جیسا کہ تاریخ گواہی دیتی ہے اور بتاتی
ہے کہ جب کبھی بھی اور جہاں کہیں عورت نے حکومت کی ہے
اس کا زمانۂ حکومت بہت کامیاب اور امن پسند رہا ہے -
برخلاف اس کے مردوں نے اپنی ترقی کی غایت ہلاکت
آفرین مآلات اور عام تباہی اور جنگی پیچیدگی رکھی ہے -
عورتوں کے حقوق مردوں نے کبھی تسلیم نہیں کئے - وہ
عورتوں کی ذات کو رشک و حسد سے دیکھتے ہیں - قانونی
امتحانات کے اعلےٰ اسناد رکھنے والی عورتوں کو کبھی وکالت
کی اجازت نہیں دیتے اور بحیثیت مجموعی اقتصادی، اخلاقی
اور تمدنی مراعات کے باب میں مرد نہایت بخل سے کام لیتا ہے -
کبھی عورتوں میں روح کا نہ ہونا بتایا جاتا ہے، کبھی کہا جاتا
ہے کہ عورت محض توالد و تناسل کی ایک دنیاء خاموش
ہے اور کبھی یہ تسلیم کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ عورت
تمامی مفاسد و معائب کی بنیاد ہے اور چونکہ وہ عورت ہے
لہذا اس کا کوئی حق نہیں ہے - بالآخر اس عام حق تلفی اور

گویا وہ حالات رونما ہیں جو روما کے تنزل اور فنا کے

زبردست مردانہ فرمانروائی کے انتہائی نقطہ کے بعد عورتوں
نے بھی اپنی نازک جماعت سازی اور خوبصورت اجتماع پسندی
سے ایک ایسی تحریک کا آغاز اور اس کے متعلق ایسے صحائف
وتالیفات کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ جس سے مردوں سے
نفرت کرنا اور اُن کے مظالم اور ہوس کاریوں کا الم شرح کرنا
مقصود ہے۔ لہذا ایسے اوراق، مطبوعہ افسانوں اور واقعہ
نگاریوں کی صورت میں اشاعت پا رہے ہیں جن کے پڑھنے سے عورتیں
تو عورتیں خود مردوں کو مردوں سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔
اگر اس کو دیکھا جائے کہ مرد کس طرح عورت سے بیوفائی کرتا
ہے۔ وہ کس حُسن وفریب سے معصوم دوشیزگاں کو اپنے
عشق کے دام میں پھنساتا ہے۔ پھر نفس پروری کے
بعد کیوں اور کیسے عورتوں کو زہر دیکر ہلاک کرتا ہے۔ اُن کے
پیدا شدہ بچّوں کو جہالت اور ذلّت کی زندگی بسر کرنے کے
لئے چھوڑتا ہے۔ اور ہاں! سب سے زیادہ تمامی شرافتوں
اور تمامی خوبیوں کا وہ کیسے اکیلا دعویدار بن جاتا ہے تو
ہمیں معلوم ہو کہ بیچاری عورت کی تمام وفا پرستیوں،
عصمت داریوں اور دلنوازیوں کا صرف اتنا صلہ دیا جاتا
ہے کہ ادیبوں اور شاعروں نے ان کو اپنے گردش قلم
میں کہیں کسی افسانہ یا مثنوی میں مرد کی دماغی اور ذہنی
عیاشی کے لئے تھوڑی سی جگہ دیدی اور بس۔ حقیقت یہ
ہے کہ مردوں نے شروع سے اس باب میں ایسی تنگ نظری
سے کام لیا ہے کہ اب اگر غور سے دیکھا جائے تو عورت کا مقصد
صرف یہ رہ گیا ہے کہ وہ اپنی جوانی اور اپنی ساری ہستی کو
دوسرے کے لطف اور دوسرے کے زیر بار احسان ہونے
کے لئے وقف سمجھے۔ خود اس کی شخصیت کچھ نہیں ہے۔ وہ
اگر جوان ہے تو کسی کی عشق بازیوں کی نشانہ بنے اور اگر وہ
جوانی سے آگے بڑھ چکی ہے تو بچّوں کی غور و پرداخت میں
مرا کرے اور اگر دوشیزگی پسند ہے تو پھر اس کا کہیں ٹھکانا نہیں
ہے۔ دُنیا کی وہ عظمت وجلال والی قومیں جن سے ادب و تاریخ
کو ناز ہے، عورتوں کے ساتھ صرف اتنا انصاف کر سکیں کہ
اپنے تخیلی تخاطب میں ان کے چشم و ابرو سے کام لیا مثلاً
بھارت ماتا کی تشکیل خیالی میں اور برطانیہ کی مجسم آرائی میں عورت
کے کالبد سے تناسب و تشبیہ کا اظہار کیا جاتا ہے مگر اس
کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکا کہ عورت کس طرح مرد کے عشق
میں مرتی ہے اور وہ کس طرح ایک زندہ خاموش قربانی بنکر
اپنے رفیق کا ساتھ دیتی ہے۔ حقائق اشیاء کی گہرائی معلوم
کرنے کے لئے انسان اضطراب آسا، میدانِ ایجاد میں دوڑتا
جا رہا ہے مگر اس نے عورت کے پر دھلائے جذبات اور
روحستانِ ناز کے معارف کی تہ تک پہنچنے کی کما حقہٗ کوشش
نہیں کی۔ ہم نے اپنے محدود ذاتی۔ قومی اور ملکی خصوصیات
خیال و عمل کے موافق عورت کے اعتراف میں وقتی تلذذ
سے کام لیا ہے یعنے اس کا اندازہ نہیں کیا کہ خود عورت، عورت

ہونے کے لحاظ سے کن جذبات اور جداگانہ خصوصیات و
مناسبات کی ایک نرالی ہستی ہے۔ اس کے وارداتِ قلبیہ
اور وجدان کا کیا عالم ہے۔ اور حیات و موت میں اس کی
ترکیب حسیات کس حد تک مرد سے مختلف ہے۔ مرد نے
فرض کر لیا ہے کہ عورت کے خیالات اور خمارات حسن و عشق
ایسے ہی ہیں جیسے اس کے ہیں۔ مرد نے صرف اپنی عینک
سے اس کی ہستی کے اسرار پر نظر ڈالی ہے۔ اے کاش مرد جانتا
کہ عورت علاوہ ایک مخلوق اور انسان ہونے کے کچھ اور بھی ہے
"فطرت کی بہترین تصنیف یعنی۔ ایک عورت!" جس کی شعریت
اور جس کی رنگینیت کی عکاسی اور پرتو نمائی کی کوشش بہت
کچھ کی گئی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ ایک یا دو نسوانی ادائیں
ہیں جنہیں بار بار اقوامِ عالم کے شعراء اور مجسمہ ساز صنم گر،
اپنے یہاں ادب کے آذرستاں میں نمایاں کرتے ہیں۔ آج
بھی کسی وقت خوش نصیبی سے قدرت کی کوئی بت نمائی
عورت کی شکل میں نظر آ جاتی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے
کہ مرد اس کے اعتراف و احساس سے اب تک قاصر ہے۔
عام عادت یہ ہے کہ مادی تشبیہات سے عورت کے لامتناہی
پیش آنے والے لطائف کو ظاہر کرتے ہیں لیکن جتنا فرق مادہ
اور روح میں ہوتا ہے اتنا ہی عورت اور عورت کے نازونیاز
کی مروجہ تشبیہوں میں ہوتا ہے۔ ہماری شاعری اور ہماری
بت تراشی سب کی سب ناقص ہیں۔ اور وہ مرد کے جذبۂ
اعتراف آمیز کی محض ایک جھلک ہیں۔ عورت کی پوری
تصویر نہیں۔ عورت فنونِ حیات کی عنوان بخش روشنی
ہے، موسیقی کی وہ تاثیر ہے جو لفظوں یا رنگوں میں کاغذ
یا پردوں پر نہیں کھینچ سکتی وہ تو ایک کہانی ہے جو نہ سنی
جا سکتی ہے اور نہ بھلائی جا سکتی ہے۔ عورت در اصل ایک ایسی
کائنات ہے جو اب تک صرف اتنی دریافت کی جا سکی ہے
کہ وہ بھی کوئی چیز ہے۔ اس کے جذبات کے بحرِ زخار اس کے
حسن و عشق کے ابشار اور اس کے عجیب و غریب حسیات
کے برِ اعظم کی تلاش میں ہم نے کوئی قدم ساحل سے آگے
نہیں بڑھایا ہے۔ ایک مترنم چشمے کی روانی میں، لہلہاتے
ہوئے سبزے میں، بکھرے ہوئے ستاروں کی ایک چادر میں
جو گم موسیقی اور بند ترانہ وشی ہے۔ وہ کچھ بھی کسی دوشیزۂ ناز
اور کسی مکمل عورت کے تبسم جلوؤں سے مناسبت نہیں رکھتی۔
شورشوں کے کامیاب انقلاب، جان سپاریوں کے مبارک
دور اور آزادیوں کے پرشور ہنگاموں میں بھی خاص دلچسپی
ہے لیکن اگر اس کے اندر عورت کا ہاتھ کام کر رہا ہے تو وہ
حقیقت میں جمہور کی آزادی جمہور کا انقلاب اور جمہور کی
آواز ہے۔ نہیں معلوم ہمارے ادبستاں اور ہمارے کارگاہِ
ہستی کی کیا حالت ہوتی اگر عورت اس میں شریک غالب
نہ ہوتی۔ شعراء نے صرف عورت کے ظاہری خوشنمائیوں
اور نظر آنیوالے حال و قال کی کیفیات اپنے مضامین میں

دکھائی، ہیں انہوں نے اس کی کوشش نہیں کی کہ عورت
کے باطنیات میں کیا عالم حسن و دلربائی ہے ۔ وہ کونسا
عالم ہے جس میں عورت کی وفا تخمیر و جزو حیات بن جاتی
ہے، وہ کونسی حالت ہے جس میں وہ کسی پر جان دیتی ہے،
وہ کیسی عجیب ساعت ہوتی ہے جبکہ کسی کی "دوشیزگی"
قدرت کی حسن پروری سے آگے قدم نکالتی ہے اور پہلا
نازک قدم شباب کی طوفان خیز چوکھٹ پر رکھتی ہے ۔ یہ
ساعت نہیں معلوم شب میں اس پر گذر جاتی ہے یا سحر
کی پر راز روشنی میں آتی اور گذر جاتی ہے ۔ اس کو کوئی شاعر
نظم میں نہیں بتا سکتا ۔ وہ مست قدرت اپنے لڑکپن کی
بے خبری سے اس طرح شباب کی نامعلوم ہوشمندی میں
گام زن ہوتی ہے کہ اس کی صبح دوشیزگی کو شام جوانی کی
آمد کی خبر نہیں رہتی ۔ وہ شورش گاہ جوانی میں اس طرح
در آتی ہے کہ کل اور آج میں کوئی فرق نہیں کر سکتی ۔

دوشیزگی کی ملکوتی دنیا کس طرح یکبارگی لوٹی جاتی ہے
اور شباب کس طرح اس کی معصومیت اور فرشتہ خصالی کو
مبدّل بہ وحشت و محبت کرتا ہے اس کو کون بتا سکتا
ہے ۔ وہ خود اپنے تئیں دیکھتی ہے کہ کل میں کیا تھی آج
کیا ہوں ۔ کل یہ قدرت کے بیل بوٹے کچھ اور تھے آج
کچھ اور معلوم ہوتے ہیں ۔ کل تک جن چیزوں میں ایک
تبسّم اور ایک سادہ دل آویزی تھی وہ آج کچھ مخمور اور
جنوں آمیز دلچسپی رکھتی ہیں ۔ اب وہ جو درختوں کے کنجوں کو
دیکھتی ہے ۔ پھولوں کو حسن میں سرشار پاتی ہے اور تاروں
کو بکھرا ہوا پاتی ہے تو خیال کرتی ہے کہ یہ سب میرے لئے
ہے ۔ جس پھول کو وہ کل تک محض توڑ کر ڈال دیتی تھی آج
وہ اس کو بالوں میں پروتی ہے اور کبھی اس کو چومتی ہے
غرضیکہ قدرت کی پوشیدہ ہنرمندیاں دوشیزگی کے معدن
میں وہ حسن کشی کرتی ہیں جو لعل و جواہر کی تزئین اور ترکیب
رنگ آمیزی میں اپنا کمال دکھاتی ہیں ۔ بہرطور عورت
کے ساتھ جو عالم گیر ناحق کوشی اور حقوق کشی مشرق و مغرب
میں جاری ہے اس نے ایک مستقل تحریک دماغی کی صورت
یہ اختیار کی ہے کہ مردوں کے صدہا سال کے فسق و فجور
اور مظالم آرائیوں سے تنگ آ کر عورتوں نے مردوں سے
دور رہنے کی عادت ڈالی ہے ۔ اور رفتہ رفتہ ترک موالات
عامہ پر عامل ہو کر مردوں کو ان کے گناہوں کی سزا دینے
کا ایک طور نکالا ہے ۔ بعض مقامات پر "شوہر اور شوہرگری"
کے مکاتب جاری کرنے کی تجویز سوچی گئی ہے جہاں جابر
مردوں اور ناحق پسندوں کو تعلیم زوج و زوجیت کے
فرائض کی دی جائیگی ۔ دلی سے ایک وفد مسلم خواتین کا
دورہ پر اٹھا ہے جو مردوں سے اپنا حق مانگنے کے لئے فریادی
اور ساعی ہے ۔ واقعی عورتوں کا ترک موالات ایک اہم نتیجہ
پیدا کرے گا اگر اس کی توسیع ہوئی ۔ دنیا کی بربریت موجود

خونِ آشامی کی جد و جہد - اور غیر مساویانہ قومی اور ملکی کشاکش کی عام حالت مردوں کے ظالمانہ مذاقِ زندگی سے متعلق ہے اس کی اصلاح کا طریقہ مغربی عورتوں نے یہ نکالا ہے کہ وہ ہمیشہ کنواری جوگن اور حورِ دوشیزہ رہنا پسند کرتی ہیں - وہ مردوں کی آئے دن کی زیادتیوں سے دل تنگ ہیں - وہ شادی کی یاس انگیز زندگی کو الوداع کہتی ہیں اور کہتی ہیں کہ مردوں نے جنگ و جدال سے سارے زمانہ کو پریشان کر دیا ہے ان کی فوجوں میں اضافہ ہماری وجہ سے ہوتا ہے اس لئے ہم تزویج کو جس سے محض سپاہ کی بھرتی میں مدد ملے ناپسند کرتے ہیں اور جب تک یہ خون ریز ذوقِ مردانہ ہے ہم مردوں سے دور ہیں اس تحریک سے یورپ کی آبادی میں یوماً فیوماً کمی ہو رہی ہے ہاں یہی ایک ترکیب ترکِ تعلق کی ہے جس سے آجکل کی تہذیب خون آشام کی کایا پلٹ سکتی ہے اب جو جزیرہ یا حکومت، حورستان نازک یا ملکِ دوشیزگاں قائم و آباد ہونے والا ہے وہ اپنے یہاں تمام شعبہائے تمدن و تہذیب عورتوں کے تحت میں رکھے گا وہ دُنیا کو دکھا دیگا کہ کامیاب جمہوریت ایسی ہوتی ہے اور یوں قوموں اور ملکوں کا مجادلہ و مقاتلہ بند ہو سکتا ہے - خلاصۂ شرائطِ جنت دوشیزگی یہ ہے کہ اس کے حدود میں وہی عورتیں رہینگی جو مردوں کو بُرا سمجھ کر مردوں سے پرہیز کریں گی اور جب وہ مردوں سے موالات کریں گی حورستان سے باہر کر دی جائیں گی یہ وہ انتہائی حالات ہیں جو دُنیا کی موجودہ زندگی اور خون فشاں کاوشوں سے رُونما ہیں -

شاہ نذیر ہاشمی غازیپوری

غزل

(از لسان القوم جناب مولانا صفی لکھنوی)

پالیا جو پانا تھا کیا بتائیں کیا پایا
نقد نازروا پایا بخت نارسا پایا

موسمِ جنوں زا کا نبض سے پتا پایا
خونِ تازہ رگ رگ میں آج دوڑتا پایا

دل رُبا نے دل پایا دل نے دلرُبا پایا
کھو کے دل یہ خوش ہیں ہم جیسے کچھ پڑا پایا

ضبط کی کوئی حد ہے انتہا تحمل کی
غم نے دل کو جب چھیڑا ساز بے صدا پایا

تم سے ہم جو کہتے تھے کیوں وہی ہوا آخر
توڑ کر کسی کا دل یہ بتاؤ کیا پایا

بس نہ چل سکا دل کا زور ناتوانی سے
پھر او بھر نے کیا دیا غم نے جب دبا پایا

باز آئے جینے سے جب یہ تلخ کامی ہے
زندگی پہ مرتے تھے اس میں کیا مزہ پایا

شام ہجر آتے ہی کیا ہوا خدا جانے
دم رُکا ہوا دیکھا دل بجھا ہوا پایا

ڈھونڈتے صفی کل تھے گم کئے ہوئے دل کو
کہئے کچھ خبر پائی کہئے کچھ پتا پایا

صفی

خیر مقدم

(از خاشہ اثر خان بہادر سید محمد فضل رب صاحب۔ آنریری مجسٹریٹ)

اس مضمون کے ساتھ ذیل کا مختصر خط موصول ہوا ہے جس کو میں سید صاحب موصوف کے الطاف بزرگانہ کی سند سمجھ کر ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔ میں اپنے محترم عنایت فرما کی اس قدر افزائی کا تہِ دل سے شکر گذار ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ موصوف کے زرّیں افکار اور ادب آموز مضامین سے "آئینہ" کی تزئین اور رونق میں اضافہ ہوتا رہیگا۔ اڈیٹر

ڈیر وحید۔ یہ چند سطور محض آپ کی خاطر سے قلم برداشتہ لکھ دی گئی ہیں .... اگر پسند ہوا اور اس کی اشاعت سے "آئینہ" مُجلد آلودہ نہ ہو جائے ..... تو اس میں اس کو جگہ دی جائے ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔ خیر طلب۔ محمد فضل رب عفی عنہ۔

ہم آئینہ کا تہِ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور کیوں نہ کریں کیونکہ دل کو آئینہ سے ایک خاص نسبت ہے جس کی قدر درحقیقت کچھ وہی خوب جانتے اور سمجھ سکتے ہیں جو اہلِ دل ہیں وہ اہلِ دل جن کے قلوب نورِ ایمان کی روشنی سے منوّر ہیں۔ وہ اہلِ دل جن کے دل زنگِ معصیت سے مثلِ آئینہ کے پاک وصاف ہیں۔ وہ اہلِ دل جن کے دل آلائشاتِ خود غرضی بغض وحسد۔ کینہ و فساد وغیرہ سے بالکل مُبرّا و معرّا ہیں۔ وہ اہلِ دل جو تصوّف کے لذّت چشیدہ و دلدادہ ہیں۔ اور وہ اہلِ دل جن کے پہلو میں خدا نے ایک ایسا دل ودیعت کیا ہے جو حقیقت میں ایک آئینہ قدرت نما ہے۔ آئینہ کا ایک خوشنما پہلو یہ بھی ہے کہ اُس سے کوئی گھر خالی نہیں۔ وہ کون گھر ہے جس میں بحسب ضرورت دس پانچ یا کم سے کم دو چار آئینے نہ ہوں۔ بلکہ ہر فرد بشر کو آئینہ کی روزانہ ضرورت ہوا کرتی ہے کیونکہ وہ انسانی صورت کے حُسن و قبح کا آئینہ ہے آئینہ دیکھا۔ چہرہ پر جو آلائش گرد و غبار وغیرہ نظر آئی۔ فوراً صاف کر دی گئی۔ اچھی خاصی صورت ہو گئی۔ آئینہ حسینوں کا خاصکر محبوب ومطلوب ہے جس میں وہ اپنی پیاری و دلکش صورت دیکھ کر خود ہی محوِ حیرت ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ پہ فریفتہ۔ آئینہ میں وہ ایک ایسی پری پیکر صورت اور پاکیزہ شمائل دیکھتے ہیں جس کو دیکھکر اُن کو خدا کی شان نظر آجاتی ہے اور آنکھیں حیران ہو جاتی ہیں!

جو چشم کہ حیران ہوئی آئینہ ہے اس کی
جو سینہ کہ صد چاک ہوا شانہ ہے اُس کا

یہ آئینہ درحقیقت آئینہ قدرت نما ہے جس میں صانع قدرت کی رنگ آمیزیاں وگلکاریاں صاف نمایاں ہو جاتی ہیں اور اُس کے صانع حقیقی ہونے کا صدق دل سے اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

یہ آئینہ صرف صورت ہی کا سنوارنے والا نہیں بلکہ محلات وایوان شاہی کے بھی زیب و زینت کا باعث ہوتا ہے۔ جس مکان یا ایوان میں قد آدم برابر آئینے لگے ہوتے ہیں اُن کی زیبائش و آراستگی کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ بعینہ یہ معلوم ہوتا ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است ہمین است و ہمین است و ہمین است

ایسے آئینوں سے مکان کی آرائش و زیبائش یقیناً دوبالا ہو جاتی ہے۔ اور اُس میں داخل ہوتے ہیں یہ دھوکا ہوتا ہے کہ اندر بھی ویسے ہی پُر فضا اور دلکش عمارت بنی ہوئی ہے جیسی وہ ہے جس میں کہ ہم ابھی داخل ہوئے ہیں۔

الغرض آئینہ کی ضرورت سے کوئی مکان یا مکین خالی نہیں بلکہ یہ ایک نہایت ضروری اور کارآمد چیز خیال کی جاتی ہے۔ لہذا ہم اُمید کرتے ہیں کہ یہ آئینہ بھی جس کا ہم اس خوش دلی سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہر ایک مکان کی زینت کا باعث ہوگا اور کوئی بھی اُس سے خالی نہ رہیگا یہ ہماری قومی اور ملکی ضروریات کے لئے بیحد مفید ہے۔ اور ہماری اخلاقی و سوشل حالت کا سنوارنے والا ہوگا۔

اب یہ مختصر مضمون اس دعا پر ختم کیا جاتا ہے کہ فضل رب شامل حال آئینہ ہوا اور اُس کی اشاعت دن دونی رات چوگنی ہوتی رہے۔ آمین۔

کلامِ ثاقب

(از حضرت مرزا ثاقب قزلباش لکھنوی)

جلوۂ حسن اک اشارے میں بہت کچھ کہہ گیا ۔۔۔ میں نہیں سمجھا مگر ہاں دل تڑپ کر رہ گیا

وادیٔ غربت میں کس سے ہو رفاقت کی اُمید ۔۔۔ کون دیگا ساتھ جب نقش کف پا رہ گیا

دور کی بھی آنچ ہے ان خشک تنکوں کو بہت ۔۔۔ کیوں جلے گلچیں اگر میرا نشیمن رہ گیا

کون سی آب و ہوا میں جا کے ڈھونڈوں میں کہ دل ۔۔۔ یا دھواں ہو کر اُڑایا اشک بنکر بہہ گیا

وقت بد تھا ہل رہے تھے قطرہ ہائے خون و آب ۔۔۔ کیا غضب آنسو گرا یا دل پگھل کر بہہ گیا

حادثوں کے زلزلوں سے جام دل چھلکا کیا ۔۔۔ ایک چلو خون ہی کیا بہتے بہتے بہہ گیا

ہوش ہی مجھ کو نہ تھا جب پہلوؤں میں لوٹ گیا ۔۔۔ مجھ کو کیا معلوم کیا جاتا رہا کیا رہ گیا

دل پہ کیوں رونگی تو اسے آسیائے نہ طبق ۔۔۔ یہ میری قسمت کا دانا تھا جو پس کر رہ گیا

زندگی اچھی سہی لیکن اسے سمجھے تو کون — دل نہیں تو عالمِ ایجاد میں کیا رہ گیا
زخم جو خونبار تھے وہ روتے روتے ہنس دئے — کچھ نہ کچھ ناوک ترا قلبِ حزیں سے کہہ گیا
ہم مذاقِ دل اگر تھا بھی تو اک طور کلیم — ہو گیا سرمہ مگر بارِ تجلی سہ گیا
ذکرِ گلشن کرنے دیتا کون وہ بھی قید میں — پردۂ فریاد میں جو کچھ تھا کہتا کہہ گیا
صبح سمجھے تھے کسے ثاقب شبِ غم ہے طویل — دل کا کوئی داغ ہو گا جو چمک کر رہ گیا

ثاقب

سائنس (علوم) اور مذہب

(مولوی محمد متین صاحب وکیل ہائیکورٹ کے قلم سے)

ہر علم و فن میں کوشش اس بات کی کی جاتی ہے کہ "امرِ حق" (TRUTH) منکشف ہو یعنی سچی بات معلوم ہو جائے "حق" سے مراد ہماری "حق" بمعنی "صدق" مقابل "کذب" نہیں ہے، بلکہ "حق" ضد "باطل" ہے۔ یعنی حق بمعنی حکم مطابق للواقع ہے۔ پس تحقیق کے معنی "حقیقت شے" یا امرِ واقعی کا جاننا ہوا۔

ہمارا علمِ حقیقی محض حقائق اشیا کا علم ہے یعنی محض اُن امور و کیفیات کا علم ہے جو نفس الامر اشیا میں موجود ہیں اور یہ علم اشیائے موجود خارجی کے چند تصورات ہیں، یا اس کو یوں سمجھنا چاہئے کہ اشیائے موجود خارجی کی صورتیں اور آثار باعانتِ قوتِ حِس ذہن میں مرتسم ہوتی ہیں اور اُس سے ذہن میں ایک حالتِ ادراک پیدا ہوتی ہے جو وجود خارجی اشیا سے مخلوط ہو کر مبدءِ انکشاف ہوتی ہے۔

مگر اُسی کے ساتھ عالمِ وجود خارجی کی ماہیت (یعنی مابہ الشئے ہُوَ ہُوَ) یعنی نفس شے کا علم ہم کو نہیں ہوتا ہم کو عالمِ خارجی کا علم بقدر امکان البتہ ہوتا ہے یعنی اُسی قدر ہوتا ہے جتنا کہ ہم بمدد اپنے حواس و ادراک (طاقت) کے اُس کو جان سکتے ہیں چونکہ تشخص ذہنی جو حقیقت میں مماثل تشخص خارجی ہے اُس کا کاشف ہوتا ہے۔ پس سبیل حصول اشیاء بانفسہا ای بماہیتہا الکلیہ بقدر امکان ممکن ہے۔ یہ ہم نہیں جان سکتے کہ عالمِ خارجی بنفسہٖ کیا ہے اور اُس کی ماہیت کیا ہے مگر مشخصات کے لحاظ سے عالم کی معرفت ہم کو ہوتی ہے جب ہم اپنی اور دوسروں کی حالت انکشاف و کیفیت ذہنیہ پر غور اور یا ہم اُن کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ

(۱) اگر حاسہ کا فعل صحیح و درست ہو تو جو کیفیات و آثار
عالم خارجی کے ہم کو محسوس و معلوم ہوتے ہیں وہ بعینہٖ اُسی
طرح دوسروں کو بھی محسوس و معلوم ہوتے ہیں۔

(۲) اور اگر ادراک کا عمل و تصرف درست ہو تو جو تصورات و صور علمیہ ہم کو حاصل ہوتے
ہیں۔ وہ ایسی طرح دوسروں کو بھی حاصل ہوتے ہیں۔ پس ان تصورات کو ہم
کہتے ہیں اور اس کا بھی یقین کرتے ہیں کہ یہ حقایق اشیائی الواقع
موجود ہیں، محض ذہنی و خیالی و فرضی نہیں ہیں پس اسباب
علم یعنی حقایق کے جاننے کے وسائط دو ہیں۔

(۱) وہ کیفیات و آثار حسیہ اشیائے خارجی (SENSE
IMPRESSION) کے جو باعث قوت حاسہ حاصل ہوتی ہیں۔

(۲) وہ تصورات و صور علمیہ جو ان کیفیات و آثار حسیہ
کی ترکیب و تفصیل و ادراک معانی جزیہ سے ذہن عالم (PRESENTA
TION) میں مرتسم ہوتے ہیں۔

عالم خارجی کا ادراک جس قدر بذریعہ حواس ظاہری یعنے
سمع و بصر و شم و ذوق و لمس کے ہم کو ہوتا ہے وہ ناقص ہوتا
ہے پھر ہم بمشارکت حواس باطنی کے صور محسوسہ اور اُس کے
معانی جزئیہ کے مدرک ہوتے ہیں۔ تکمیل و نمو قوت حس کی
جو علم و ادراک کا اصل ذریعہ ہے بتدریج ہوئی ہے۔ مبدء و
باعث اس قوت حس کے وہ اجزائے اولیہ ہیں جو ابتدا
میں تمام جلد بدن میں داخل و موجود تھے مگر مطابقت ماحولیہ
فعل تاثیرات خارجی و انفعال اعصاب سے ایک کیفیت خاص
ہر عصب میں پیدا ہوگئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف قوتیں
اعضائے جسم کے لئے مخصوص ہوگئیں مثلاً آنکھ سے روشنی
و رنگ کا ادراک کان سے قبول اصوات، ناک سے امتیاز
رائحہ مخصوص ہوگیا یہ قوتیں موہوبی نہیں ہیں بلکہ کام کی
تقسیم اور محنت کی تفریق ہمارے بدن کے اجزائے اولیہ
نے خود ہی کرلی اور خاص حس کے لئے خاص عضو و آلہ
مخصوص ہوگیا پھر وہ کیفیت سلف سے خلف میں توریثاً
منتقل ہوگئی۔ ہمارے آلات حس ابتک کمال کو نہیں پہنچے۔ عقاب
کی نظر ہم سے کہیں زیادہ تیز و باریک دُور بیں ہے کتوں
اور بلیوں میں قوت شامہ ہم سے زیادہ ہے، اکثر طیور
بہت خوش الحان ہیں اور بعض قوت حس تو ہم میں پائی بھی
نہیں جاتی۔ مچھلیوں اور اکثر دریائی جانوروں میں ایک خاص
قسم کی قوت حس ایسی ہے جس سے ان کو پانی کی کیفیت
اور اُس کے دباو کا حال معلوم ہوجاتا ہے پس ہم اپنے
حواس ظاہری سے (خاصکر دیکھنے اور چھونے سے) اشیاء
خارجی کی صرف بعض حالتوں کے مدرک ہوسکتے ہیں نہ کہ
اُن کے جمیع حالات کے، اور یہ جزوی ادراک بھی ناقص ہے
اس معنی میں کہ ہمارے آلات ادراک ناقص ہیں عصبات
حس محض صورت اور نقشہ آثار محسوسہ کا نقل عن الاصل
ہمارے ذہن و دماغ میں پیش کرتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ حقایق
اشیاء کا جمیع علم و ادراک موقوف و منحصر ہے دو امر طبعی پر اوّل

اشیائے خارجی کے اُن آثار پر جو ہمارے آلات حواس میں قوتِ حاسّہ کے ذریعہ سے پیدا ہوتے ہیں اور دوم اُن آثار کے ترتیب و موافقت سے جو تصورات کہ ذہنِ عالم میں حاصل ہوتے ہیں اُن پر آلاتِ حسّ اجسام بسیط ہیں یعنی بدنِ انسان وغیرہ کے اجزائے اولیہ ہیں۔ یہ اجزائے اولیہ ہمارے نظامِ عصبی ہیں۔ آلاتِ تصوّر دماغ کے مراکزِ حس ہیں جو نظامِ عصبی وسطی ہیں اور یہ مراکزِ حس ملتقیٰ و موضع اجتماع و مس انہیں اجزائے اوّلیہ کے ہیں۔ نظامِ عصبی ایک ایسا مکمل نظامِ آلات و اعضائے حیوانات طبقۂ اعلیٰ ہے جو مبدءِ جمیع افعال و منشی و مرکز حیات و روح نفسانیہ ہے۔ یونانی حکیم قلادیوس جالینوس باشندہ برغموس نے جس کو دوسری قرن مسیحی میں روما میں بعد ابیراطو رمرقس اوریلیوس صناعت طب میں بہت عروج حاصل ہوا اور جس کی تصانیف تیرہ سو برس تک عدیم النظیر و مرجع حکما و اطبا خیال کی جاتی تھیں، قوت نفسانیہ کا محل دماغ و اعصاب قرار دیا ہے اور مدرکہ و محرکہ میں تقسیم کرکے مدرکہ کو باعثِ حس و ادراک کہا ہے اور خرد بین کے نظارہ سے بھی مبدءِ حس حواس ظاہری میں اجسام بسیط اور حواس باطنی میں مراکزِ حس جو ہر دماغ میں پائے جاتے ہیں پس نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صورِ جزئیاتِ مادّیہ حواس میں ہوتا ہے اور حواس ہی مدرک جزئیات ہے اگر ایسا نہ ہو تو بڑی دقت یہ پیش آئے گی کہ جب حالت ادراکیہ قائم بالنفس مانی گئی اور صورِ جزئیاتِ مادّیہ حواس میں قرار دی گئی تو دونوں کا اختلاط کیسے ممکن ہوگا۔

اہلِ علوم و سائنس نے علوم نظریہ کے مسائل غامضہ کے حل اور معتقدات رقیقہ کے کشف کے دو طریقے رکھے ہیں۔ ایک تجربہ و نظر، دوسرا استدلال نیں حقائق اشیا و احکام واقعیہ کے جاننے کے لئے بھی جو اہم اور مشکل ترین مسئلہ ہے، یہی دونوں طریقے ہم کو اختیار کرنا چاہئے۔ قوتِ نظری (اکتسابات نظریات) بدیہیات محسوسہ کے مشاہدہ و تجربہ سے حاصل ہوتی ہے۔ ہم عالمِ خارجی کا ادراک اور احوال موجودات کا اکتساب اولاً اپنے حواس ظاہری سے (یعنی آلاتِ حس سے) اور ثانیاً باعانت حس باطنی (یعنی مراکزِ حس سے جو جوہر دماغ میں ہیں) کرتے ہیں۔ تجربہ ہم کو بذریعہ مشاہدہ یعنی بمجرد التفات و بانضمام حدس ہوتا ہے۔ پس احوال واقعیہ عالم جو مشاہدہ سے بذریعہ حواس ہم کو معلوم ہوتے ہیں اور احوال کیفیاتِ نفس جو التفات سے ہم کو منکشف ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جمیع کیفیات و تجربات جو ہم کو آلاتِ ظاہری و باطنی سے حاصل ہوتے ہیں وہ پھر بشکل تصورات و صور علمیہ دماغ کے اور دوسری قوتوں کے فعل سے بن جاتے ہیں اور یہ سب صور محسوسات (بعد غیبوبیت) ذہن میں مجتمع، و محفوظ رہتے ہیں اور یہ حالت اور ترتیب مقدمات تعلیل و استدلال سے ہوتی ہے تکمیل استدلال

من العلۃ علی المعلول ہے۔ رہ گیا معانی جزئیہ میں تفریق و تفصیل۔ تجرید۔ کلیات و وہمیات کا قائم کرنا اور تکمیل قوتِ خیال یہ سب باتیں دماغ کے دیگر قوتوں سے حاصل ہوتی ہیں اور ان سب کو ہم مجموعی حیثیت سے عقل کہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ پول فلکسگ باشندہ لیپزک نے قوتِ متخیلہ کا انکشاف کیا اور اُسکا محل بطنِ دماغ میں قرار دیا اور سب سے پہلے اُسی نے یہ ثابت کیا کہ بطن دماغ میں بھورے رنگ کا جو گودا ہے اُس میں چار مرکز آلات حس بطور چار کرہ کے ہیں ایک کرہ قوت لامسہ کا ہے دوسرا قوت شامہ کا تیسرا قوتِ باصرہ کا چوتھا قوتِ سامعہ کا اور ان چاروں کروں کے درمیان چار بڑے مرکز خیال واقع ہیں اور مراکز حس اور مراکز خیال و ادراک کے بیچ میں حد فاصل اعصاب ہیں اور یہ مراکز خیال مبدءِ اصلی ہمارے حیاتِ ذہنی کے ہیں اور باعث علم و ادراک و فہم و شعور و عقل و تمیز ہیں اور جب ان میں سے کوئی ماؤف ہوجاتے ہیں تو اُس سے جو قوت تعلق رکھتی ہے اُس کا فعل بھی ساقط و زائل ہوجاتا ہے اور اُس کا بھی کافی ثبوت موجود ہے کہ چونکہ دماغ میں اسباب خارجیہ کے باعث جو تغیرات پیدا ہوتے اُن کا اثر حس و ادراک پر ہوتا ہے مثلاً چاے و قہوے سے قوت خیال میں انتعاش ہوتا ہے وعلی ہذا القیاس یورپ کے اہلِ سائنس کو اس تحقیقات و انکشافات پر بہت ناز ہے اور اس کا موجد فلکسگ بیان کیا جاتا ہے کہ اُس نے سنہ ۱۸۹۰ء کے قریب یہ امر جدید دریافت کیا مگر حقیقت میں یہ ایسا نہیں ہے۔ یہ قول قدیم ہے اور قانون شیخ بوعلی سینا میں موجود ہے ہم اُس کی عبارت نقل کرتے ہیں:۔

الفصل الرابع فی القوای وھی ثلثۃ اقسام احدھا قوۃ طبعیۃ وھی فی الکبد وحیوانیۃ وھی فی القلب ونفسانیۃ فی الدماغ .... واما النفسانیۃ فتنقسم الی مدارکۃ ومحرکۃ اما المدارکۃ فتنقسم الی ما فی الظاہر والی ما فی الباطن اما التی فی الظاہر فھی السمع والبصر والشم والذوق واللمس واما التی فی الباطن فھی حس المشترک والخیال والمتفکرۃ والحافظۃ والواھمۃ اما الحس المشترک فھی قوۃ التی تتادی الیھا جمیع الصور المحسوسات ومحلھا اول البطن المقدم اما الخیال فھی التی تحفظ ما یقتنیہ الحس المشترک من الصور المحسوسات بعد الغیبوبۃ ومحلہ اخر البطن المقدم من الدماغ واما المتفکرۃ فھی التی تتصرف فی الصور المحسوسۃ ومعانیھا الجزئیۃ بالترکیب والتفصیل مثل ان تتخیل انسانا ذا راسین فقد رکبت راسا الی بدنہ ومثل ان تتخیلہ عدیم الراس فقد فصلت راسہ عن بدنہ ومحلھا اول البطن الاوسط من الدماغ واما الوھم فھی القوۃ التی تدرک بھا المعانی الجزئیۃ المتعلقۃ

بالمحسوسات من الموافقة والمخالفة والعداوة   اما محافظة فهی التی تحفظ المعانی المدرکة بالوهم
والصداقة ومحلها آخر البطن الاوسط من الدماغ   ومحلها البطن الاخر من الدماغ .... +

The most important development is the discovery of the organs of thought by Paul Flechsig of Liepsig; he proved that in the grey-bed of the brain are found the four seats of the central sense organs or four "inner spheres of sensation." The sphere of touch in the vertical lobe; the sphere of smell in the frontal lobe; the sphere of sight in occipital lobe, the sphere of hearing in the corporal lobe. Between these four "sense centres" lie the four great "thought centres" or centres of association, *the real organs of mental life.* They are those instruments of psychic activity that produce thought and consciousness. In front we have the frontal brain or centre of association behind, on top there is the vertical brain, or parietal centre of association, and underneath the principal brain, or "the great occipito-temporal centre of association" (the most important of all); lower down, and internally, the insular brain or the insula of Reil, the insular centre of association. These four "thought centres" distinguished from the intermediate "sense centres" by a peculiar and elaborate nerve structure, are the true and sole organs of thought and consciousness. Flechsig has recently pointed out that, in the case of man, very specific structures are found in one part of them; these structures are wanting in the other mammals, and they, therefore, afford an explanation of the superiority of man's mental powers.

(باقی)   مولوی محمد متین

رویت ہمہ سال لالہ گوں باد

تضمین برغزل حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ

(از مرزا تصدق حسین صاحب تصدق جائسی)

عشق تو یہ عقل رہنموں باد　　آغشتہ سرم بخاک و خوں باد　　گھیرے رہیں تیرا در فدائی　　چوکھٹ پہ صدا ہو جبہ سائی

زلفِ تو محرّکِ جنوں باد　　حُسن تو ہمیشہ درفزوں باد　　دن دونی ہو شان خودنمائی　　چشمِ تو زبہر دلربائی

رویت ہمہ سال لالہ گوں باد　　درکردنِ سحر ذُو فنوں باد

اے کانِ صباحت و ملاحت　　اے ماہ جبیں و مہر طلعت　　جھیلا ہے غم فراق بےحد　　اللہ کرے برآئے مقصد

اے معدنِ خوبی و لطافت　　اندر سرِ من ہوائے عشقت　　ہر کس کہ بہ ہجر تو نہ سازد　　اے لالہ عُذار اے سہی قد

ہر روز کہ ہست درفزوں باد　　از حلقۂ وصل تو بروں باد

اے زینتِ خاکدانِ عالم　　اے رونقِ بوستانِ عالم　　ہے صدق تو رازدانِ حافظ　　ہو کیوں نہ وہ ہمزبانِ حافظ

اے قاتلِ خلق و جانِ عالم　　قدِّ ہمہ دلبرانِ عالم　　اے دلبرو دلستانِ حافظ　　لعلِ تو کہ ہست جانِ حافظ

درخدمتِ قامتت نگوں باد　　دور از لبِ ہر خسیس دوں باد

حاصل ہو کمالِ حُسن تجھ کو　　پروانہ ہو خلق شمع تو ہو

مرتے رہیں تجھ پہ زندہ ہیں جو　　ہرجا کہ دلیست در غم تو

بے صبر و قرار و بے سکوں باد

صدق

صبحِ شباب

(مصنفہ ابوالمعالی وحیدالدین احمد کڑوی)

التماس

مصنف، فسانہ شروع کرنے سے پہلے، یہ عرض کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہے کہ یہ ناول کسی خاص مفید مقصد کو مدنظر رکھکر نہیں لکھا گیا، اس میں تو کم سنی یا نارضامندی کی شادی کے بُرے نتائج دکھلائے گئے ہیں، اور نہ مذہبی مسائل یا بے پردگی کی بُرائیاں ناول کے پیرائے میں بیان کی گئی ہیں، اس تصنیف کا مقصد نہ کسی مرد کے اخلاق کی اصلاح اور نہ کسی عورت کو اصولِ خانہ داری کی تعلیم دینا ہے یہ نہ مرقعِ عبرت ہے اور نہ عشق و محبت کا البم، یہ نہ اوریجنل ہے اور نہ اچھوتا، بلکہ واقعی معنوں میں یہ کتاب کسی لحاظ سے ایک علمی تصنیف کہلائے جانے کی مستحق نہیں! اس کی زبان کو نہ تو دہلی کی با محاورہ اور ٹکسالی اُردو ہونے کا فخر ہے اور نہ اس کی عبارت کو لکھنؤ کی سلیس و شستہ روزمرہ ہونے کا دعویٰ! بلکہ اکثر حصّے اس کتاب کے اُس غیر مانوس اور بھونڈی زبان میں لکھے گئے ہیں جو عموماً "دیوزاد کی زبان" کہلاتی ہے ناول کا قصّہ بالکل بے بنیاد فرضی۔ اور من گھڑت ہے اور اس کہانی کے دُنیا کے انسانوں کا وجود سوائے فسانہ نویس کے دماغ کے اور کہیں نہیں ہے۔ اس کتاب کا مقصد اس قدر ہے کہ اگر اس مشغول و باکار دنیا میں کسی بیکار انسان کے دو لمحے اس تضیعِ اوقات میں لطف سے گذر جائینگے تو مصنف سمجھیگا کہ اس کی محنت وصول ہو گئی۔

۲۲۔ اپریل ۱۹۲۳ء
الہ آباد

اپنے ایک دوست کے نام

میری رُوح کی راحت! میں اپنی اس پہلی ناچیز تصنیف کو تمہارے عزیز نام پر معنون کرتا ہوں! تمہاری سچی اور بے لوث محبت میرے ستم رسیدہ دل کا سہارا اور میرے دُکھ و درد کا چارہ ہے! تم جانتے ہو کہ اس غم و فکر کی مکروہ اور بے وفا دنیا میں تم میرے تنہا غمخوار ہو!!!

ترا بہ ہر گذرے ہست بیقرار دگر — مرا بجز تو کسے نیست غمگسار دگر

(نژنگار کی اجازت سے شایع کیا گیا)

پہلا باب

امین الدین احمد خان ایک پرانے خاندانی بزرگ تھے، جو علاوہ شرافت و نجابت کے مال و دولت بھی رکھتے تھے۔ ہرچند یہ بات سُننے والے کو شاید عجیب معلوم ہو گی۔ کیونکہ اس زمانے میں دولت و شرافت کا اجتماع اجتماعِ ضدین سمجھا جاتا ہے تاہم یہ امرِ واقعہ تھا کہ

حسن الدین خاں نامی اپنے قصبے میں بلکہ دور دور تک ایک نہایت
خوشحال رئیس مشہور تھے اور اپنی زندگی بڑی عزت و فارغ البالی
سے بسر کر رہے تھے۔ وہ ایک نہایت ظریف و حیادار وضعدار
بزرگ تھے اور اپنی وضعداری اور خاندانی عزت بڑی خوبی
سے سنبھالے ہوئے تھے۔ عربی و فارسی میں بڑی اچھی دستگاہ
رکھتے تھے اور اپنے کو علم قیافہ اور علم معمّہ کا بھی ماہر جانتے تھے۔

آدمی پرانے خیالات کے تھے اور انگریزی اور علوم جدیدہ
کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن کچھ لوگوں کے کہنے سننے
سے اور کچھ ضروریات زمانہ سے مجبور ہو کر اپنے چھوٹے لڑکے
سعید الدین خاں کو انگریزی پڑھانے پر راضی ہو گئے تھے
جو اس وقت میرٹھ کالج کے درجے ایف۔اے میں
تعلیم پا رہا تھا۔ سعید کا بڑا بھائی حمید الدین خاں گھر پر رہتا
تھا اور جائداد وغیرہ کا انتظام بھی بڑی حد تک اسی کے ہاتھ
تھا۔ حمید نے عربی، فارسی کی ابتدائی تعلیم دیوبند کے
مدرسے میں پائی تھی اور دیندار باپ کی نیت اور خواہش
یہ تھی کہ اپنے بڑے لڑکے کے سر پر دستار فضیلت بندھوائیں
اور حمید مولوی حمید الدین کہلائیں۔ لیکن حمید جیسے سعادتمند
فرزند اس پر راضی نہ ہوئے۔ انھوں نے فوراً اپنی عقل سلیم
کو رہنما بنا کر اور حکمت کو مولویت پر ترجیح دے کر طب کا مطالعہ
شروع کیا۔ مگر ان کا دماغ نخوت و خود بینی سے اس قدر بھر
گیا تھا کہ اس میں کسی دوسری چیز کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔
وہ اپنے باپ کی بدقسمتی سے دنیا کے ان نکمے انسانوں میں
تھے جو کبھی کسی کام کو پورا نہیں کر سکتے چنانچہ وہ نہ تو مولوی
ہوئے نہ حکیم۔ لیکن وہ اپنے خیال میں اپنے آپ کو ایک
لائق حکیم اور نہایت قابل مولوی سمجھتے تھے۔ اور کبھی کسی نمازی
جولاہے کو مسئلہ بتانے یا اپنے غریب پڑوسیوں کا علاج کرنے
اور دوا بتانے میں کوتاہی نہ کرتے۔ اس سے کچھ بحث
نہ تھی کہ مرض ان کے سمجھ میں آیا یا نہیں۔ لیکن تشخیص ضرور فرماتے
اور دوا بھی تجویز کر آتے۔ سب سے بڑا ستم یہ تھا کہ اگر کوئی حکیم
ان کے نسخے میں کچھ نقص نکالتا یا مریض کے رشتہ دار ان کی
بتائی ہوئی دوا کے استعمال میں ہچکچاتے تو حمید سخت ناراض
ہوتے اور اس حکیم کو اس کے پیچھے ہزاروں گالیاں سناتے
اور ان لوگوں کے تو جانی دشمن ہو جاتے۔ حقیقت میں حمید
اس قسم کے انسانوں میں تھے جو کچھ نہیں جانتے اور پھر سمجھتے
ہیں کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ ایسے لوگ عموماً سخت مغرور
اور صد درجے کے حاسد ہوتے ہیں۔

حمید انگریزی تعلیم اور انگریزی وضع قطع کا محض اس لئے
مخالف تھا کہ وہ خود انگریزی نہ جانتا تھا۔ وہ قدما کی کورانہ
تقلید اپنا فخر اور مذہبی معاملات میں ضد، تعصب اور جہالت
سے کام لینا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کو اپنے چھوٹے بھائی
سعید سے اس لئے نفرت تھی کہ دوسرے اس کو کیوں اچھا سمجھتے
تھے اور وہ سارے قصبے میں اپنے تمام ہمسنوں سے زیادہ ہر دلعزیز تھا۔ گھر

کے تمام نوکر سعید کو حمید پر ترجیح دیتے اور کریم اللہ، امین الدین
خاں کا پرانا نمکخوار اور قدیم خاندانی نائی، کھلم کھلا چھوٹے کو
لائق اور بڑے بھائی کو نالائق قرار دیتا۔ سعید بھی جب کبھی چھٹیوں
میں گھر آتا تو بڈھے کریم اللہ کے گھر کی طرف سے گذرتے
ہوئے ضرور دو چار منٹ اس کے گھر والوں کی خیریت دریافت
کرتے اور اس کی دلچسپ باتیں سُننے میں صرف کرتا۔ بڈھا نائی
بھی بڑے شوق سے غدر کے قصے اور سعید کے دادا کی بہادری
کی داستانیں سُناتا اور جب سعید چلنے لگتا تو ہزاروں دعائیں
دیکر رُخصت کرتا۔ ایک دن گرمیوں کی شام کو امین الدین
خاں اپنی نشست گاہ کے صحن میں، کمرے کے سامنے والے
چبوترے پر ایک تخت پر تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ تخت پر قالین
اور قالین پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی اور خاں صاحب ڈاڑھی
چڑھائے، نہایت صاف اور دو دھیے سفید کپڑے پہنے۔
گاؤ تکیہ کے سہارے، پوربی شُرفا کی مخصوص اور محبوب انداز نشست سے
بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی پیٹھ تکیے سے لگی ہوئی تھی، حُقے
کی مُہنال مُنہ میں، بایاں پاؤں داہنی ران کے نیچے اور
داہنا پاؤں بائیں ران کے اوپر تھا۔ اس پاؤں کو وہ ہلکے ہلکے
ہلاتے جاتے تھے اور اس کے صاف اور ضعیف تلوے کو
بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے سہلاتے بھی جاتے تھے۔ سامنے کچھ
مونڈھے بچھے ہوئے تھے، جن میں سے ایک پر حمید خان اور
دوسرے پر اس قصبے کے خاندانی حکیم محمد یحییٰ صاحب اور
تیسرے پر اس قصبے کے ایک فرشتہ خصلت بزرگ میر
عنایت علی بیٹھے ہوئے تھے۔ میر عنایت علی ایک نہایت
متقی پرہیزگار اور خدا ترس بزرگ تھے۔ ان کا دستور تھا کہ
عصر کی نماز مسجد میں ادا کر کے امین الدین خاں کے یہاں
آجاتے اور مغرب سے پہلے کا وقت وہیں گذارتے۔ امین الدین خاں
نے اپنے مغرور، بددماغ اور ادھیڑ داروغہ، احمد خاں سے
جو ایک عمدہ تنزیب کا کرتہ، سیاہ پمپ اور لکھنؤ کی
چُنی ہوئی ٹوپی پہنے، تخت کے قریب کھڑا تھا، اُس کرخت
پوربی لب و لہجے میں، جن کو ان اطراف کا رئیس و زمیندار اپنی
ریاست کا جُزو سمجھتا ہے (کیونکہ پورب کے رئیس نوکر سے
نرم لب و لہجہ میں بات کرنا شان امارت کے خلاف سمجھتے
ہیں) ڈانٹ کر کہا "ارے احمد خاں برف اب تک نہ آیا۔
وہ مردود نضلو کہاں مرگیا۔ کمبخت ابھی تک نہیں لوٹا"
میر عنایت علی سے مخاطب ہو کر۔

"میر صاحب وقت دیکھئے گا آپ کی گھڑی میں کیا
بجا ہے؟"

میر عنایت علی نے جو نماز کا وقت دیکھنے کے لئے
گھڑی ہر وقت ساتھ رکھا کرتے تھے جیب سے ایک پرانی
وضع کی ڈھکنے دار گھڑی نکالی اور کہا کہ "پانچ بجکر ۹ منٹ
ہوئے ہیں"۔

امین الدین خاں (داروغہ سے) "پانچ بجکر ۹ منٹ ہوئے

ہیں اور ریل ۳ بجکر ۴۵ منٹ پر آتا ہے؟"

داروغہ۔ "جی حضور"

امین الدین خاں۔ "تو پھر یہ حرامزادے کا بچہ فضلو کہاں مرگیا؟"

داروغہ۔ حضور شاید گاڑی آج لیٹ آئی ہے۔ ابھی تک تو کوئی یکہ واپس نہیں آیا۔"

اتنے میں دروازہ کھلا اور فضلو ایک سیاہ کمبل میں برف لپیٹے بیٹھک کے اندر داخل ہوا۔

فضلو کے آنے کے دو ایک منٹ بعد ہی ایک نہایت بھاری بھرکم اور شاندار بزرگ جو اس قصبے کے زمیندار اور آنریری مجسٹریٹ بھی تھے۔ ایک خاص تزک و احتشام کے ساتھ داخل ہوئے اور داخل ہوتے ہی اپنے مخصوص پوربی لب ولہجے میں چلائے۔

کیوں خاں صاحب!

ہم کیسے ٹھیک وقت آئیں کہ اِدھر برف آوا اور اُدھر ہم داخل ہوئے۔ بہرکیف ہم اس ارادہ سے تو نہیں آئے کہ آپ کا برف آدھیاویں لیکن برف دیکھ لیا ہے اب بغیر پیئے نہ جائینگے۔"

تمام لوگ ان بزرگ کے داخل ہوتے ہی تعظیماً کھڑے ہوگئے اور یہ بھاری بھرکم مجسمہ جن کی ہر ادا سے غرور یا شان امارت ٹپکتی تھی ایک رئیسانہ انداز سے آکر ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے۔

اور امین الدین خاں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔

"کہو اب سعید کیسا ہے؟"

امین الدین خاں۔ "اب تو آپ کی دعا سے اس کی حالت روبہ صحت ہے حکیم صاحب بڑے غور و فکر سے علاج کر رہے ہیں۔ اللہ نے اُن کے ہاتھ میں شفا بھی دی ہے۔ اُمید تو ہے کہ پندرہ بیس دن میں بالکل اچھا ہو جائیگا۔۔۔۔۔۔۔

ابے خدا بخش خان بہادر صاحب کے لئے ایک گلاس برف کے پانی کا بنا لا۔ ۔۔۔۔۔۔

سعید نے صاحب اس بیماری میں بڑی تکلیف اُٹھائی آج اسے بیمار ہوئے پورا ایک مہینہ ہوتا ہے"

خان بہادر احمد یعقوب بیگ۔ "بہرکیف خدا اسے اچھا کرے جب سے بیمار ہوا ہے ان کی خالہ (مراد اپنی بیوی سے) بہت پریشان ہیں"۔

امین الدین خاں۔ "خیر اب پریشانی کی تو کوئی وجہ باقی نہیں رہ گئی۔ خدا کے فضل سے خطرے کی حالت تو گذر گئی جو کچھ خیال ہے وہ محض اس کی کمزوری کا"۔

حکیم صاحب۔ "انشا اللہ وہ بھی جلد رفع ہو جائیگی"

خان بہادر صاحب۔ "سعید تو تھا بھی ہمیشہ کا نحیف ولاغر!"

امین الدین خاں۔ "جی ہاں اور اس پر یہ علالت

قیامت ہوگئی۔ ارے برف کا پانی اب تک نہ لایا؟"

خان بہادر۔" ہوگیا مت چلائیے لاتا ہوگا۔"

امین الدین خاں۔" کہئے تو تھوڑی دال موٹ منگواؤں؟ کل مولانا کوثری آگرے سے لائے ہیں۔"

خان بہادر۔" ہاں منگواؤ ہم بہت بھوکے ہیں۔"

نوکر نے ایک طشتری میں دال موٹ اور ایک گلاس میں پانی لاکر رکھدیا۔ خان بہادر احمد یعقوب بیگ صاحب دال موٹ سے شغل بھی فرمارہے تھے اور باتیں بھی کہتے جاتے تھے۔" خیر خدا کا شکر کیجئے۔ اس نے بڑا فضل کیا۔ سعید بچ گیا۔ ورنہ بیماری کمبخت بڑی مہلک تھی۔"

امین الدین۔" جی ہاں!

بس یوں سمجھئے گویا دوبارہ زندگی نصیب ہوئی ہے۔ لوگ تو اس کو اس گھر کی آرزو اور اُمید سمجھتے ہیں۔"

حکیم صاحب۔" بیشک!

سعید ہے بھی ایسا ہی ہونہار لڑکا۔"

خان بہادر صاحب۔ بڑا ہونہار۔ بڑا نیک چلن۔ بڑا سعادتمند۔ ارے صاحب سعید واقعی سعید ہے۔ اللہ اس کی عمر میں برکت دے اس سے تو اس قصبے کا نام روشن ہوگا۔

افسوس! مولوی اکرام اللہ خاں مرحوم کہا کرتے تھے کہ یعقوب! اقبال اس قصبے سے چلا اور دولت بھی ان کے مرتے ہی جو بربادی شروع ہوئی تو قصبے کا قصبہ ویران ہوکر رہ گیا۔"

امین الدین خاں۔" جی ہاں! ہمارے دیکھتے دیکھتے کیا سے کیا ہوگیا۔ اب نہ وہ احاطے کی نشست رہی، نہ وہ لوگ رہے، نہ وہ طبیعتیں رہیں، مرزا غلام رسول کا خاندان دیکھتے دیکھتے بگڑ گیا"

خان بہادر صاحب۔" صاحب! ایک غلام رسول؟ بیسیوں بگڑ گئے، وہ بات ہی مارہی جو رونق و چہل پہل ہمارے بچپن میں تھی وہ اب خواب میں بھی نہیں دکھائی دیتی۔ بہرحال دنیا کا دستور یہی ہے کوئی کیا کرے کہاں تک رو۔ وے۔"

حکیم صاحب (ٹھنڈی سانس لیکر)" خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی ✦ ہزاروں اُٹھ گئے لیکن وہی رونق ہے محفل کی۔"

حمید خاں (چپکے سے حکیم صاحب کے کان میں) سبحان اللہ واہ حکیم صاحب واہ! کیا برمحل شعر فرمایا۔

حکیم صاحب جن کو اپنی سخن فہمی اور زبان دانی کا سخت مغالطہ تھا ذرا بیں بہ جبیں ہوکر مگر چپکے سے بولے" میاں! آپ ہیں ابھی صاحب زادے! آپ کیا جانیں شاعری کیا چیز ہے!

ابھی کوئی عاشقانہ شعر پڑھتا تو لوٹ جاتے لیکن چونکہ یہ شعر گل و بلبل کے تذکرے سے خالی ہے آپ ہنس پڑے

اور لگے بتلانے! حضرت! آپ کیا جانیں سادگی بیان کیا چیز ہے! یہ شعر وہ ہے جس کے لفظ لفظ سے حسرت و عبرت ٹپکتی ہے"۔

حمید خاں :- "واقعی حکیم صاحب یہ تو میری نالائقی اور کم فہمی ہے ورنہ ایسے نادر اشعار کے سمجھنے اور یاد رکھنے والے آجکل میسر کہاں ہیں"۔

اتنے میں مغرب کا وقت قریب آیا اور سب نماز پڑھنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

حمید اور حکیم صاحب سب کی نظر بچا کر چپکے سے باہر نکل آئے ادھر وہ لوگ نماز کی تیاری میں مشغول تھے اور ادھر حکیم صاحب جو عموماً نہایت بااثر و مشہور تھے شاعری فرما رہے تھے کبھی شفق کو دیکھ کر کوئی شعر پڑھتے، کبھی شام کی خاموشی اور سناٹے پر کوئی مصرعہ سُناتے غرض اسی طرح یہ بیوقوف حکیم، چالاک اور حاسد حمید پر اپنی سخن فہمی اور سخن دانی کا سکہ جمانے کی کوشش لاحاصل میں مشغول تھا کہ سورج، خان بہادر احمد یعقوب بیگ جیسے بخیل کی طرح "اپنا طلائی زیور سمیٹ کر رُخصت ہو گیا" اور سامنے کے میدان سے بڑھتی ہوئی تاریکی دُنیا پر چھا گئی۔

وحید

بیکسی و کس مپرسی

(ایک مضمون کو اپنے وقت کے چار اساتذہ نے کس طرح ادا کیا)

دوست دشمن می شود صائب بوقتِ بیکسی (صائب) خونِ زخمِ آہواں رہ می برد صیاد را

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے (ناسخ) کہ سایہ بھی جدا رہتا ہے تاریکی میں انساں سے

تلسی کیسے کے پڑے بہت۔ انہت ہو جاے (تلسی داس) بدھیا۔ بدھنے۔ مرگ بان سو۔ ادھرے دیت بتاے

تلسی بُرا وقت آنے پر اپنا بیگانہ ہو جاتا ہے ترجمہ شکاری جب شکار کرتا ہے ہرن کو تیر سے تو اسکا اپنا خون بتاتا ہے کہ ہرن کدھر گیا ہے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے (ثاقب) جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

اڈیٹر

حسن کافر کا دوسرا حملہ

(از حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

افشائے رازِ عشق کا ساماں کئے ہوئے — پھر آئے ہیں وہ بال پریشاں کئے ہوئے
پھر مست چل رہی ہے ہوا کوہ و دشت میں — ہر شے کو اپنی رو میں گلستاں کئے ہوئے
خنجر بکف بڑھا ہے مری سمت حسن پھر — گیتی کو اپنے ہاتھوں تک عریاں کئے ہوئے
پھر آ رہا ہے میری طرف مطربِ جنوں — دنیا کو اپنے ساتھ غزلخواں کئے ہوئے
پھر آ رہا ہے کوئی نظر دل پہ ڈالتا — ہر جنبشِ نگاہ کو پیکاں کئے ہوئے
پھر آئے ہیں وہ سامنے اُلٹے ہوئے نقاب — شعلۂ طور اک نگاہ میں پنہاں کئے ہوئے
پھر قشقہ بر جبیں کوئی نکلا ہے دیر سے — آہنگ آزمائشِ ایماں کئے ہوئے
پھر گرم اختلاط ہیں وہ اپنے حسن کے — سارے خصوصیات نمایاں کئے ہوئے
کم ہو چلی تھیں دل کے دھڑکنے کی کاہشیں — پھر آ گیا وہ زلف پریشاں کئے ہوئے
پھر آ کے اُس نے کفر کا اقرار لے لیا — مدت ہوئی تھی دل کو مسلماں کئے ہوئے

پھر آ رہا ہے جوشؔ کوئی قتلگاہ میں
شعلے کی طرح تیغ کو عریاں کئے ہوئے

جوشؔ

درسِ انقلاب

اس ڈرامے کا پلاٹ، جرمنی کے مشہور مصنف شیلر کی معرکۃ الآرا تصنیف ولیم ٹل سے، لیا گیا ہے۔ یہ ڈراما سوئیٹزرلینڈ کی سچی انقلابی تاریخ اور فنِ ڈرامانویسی کے علاوہ، جو گوئٹے کے دستِ راست یعنی شیلر کا خاص حصہ تھا، انقلاب کے مختلف پہلو و منازل کا ایک صحیح مرقع، اور حقیقی معنوں میں ایک طالب علم سیاست کے لئے مکمل درس ہے۔

حامد جمال

پہلا ایکٹ

پہلا سین

سوئیٹزر کے مقابل لوکرائن جھیل کا بلند پتھریلا کنارہ ہے۔ کنارے سے تھوڑے فاصلہ پر ایک جھونپڑی ہے۔ ملّاح کا لڑکا اپنی کشتی پر بیٹھا لنگار رہا ہے۔ جھیل کے پار سویز کے چراگاہیں نظر آتی ہیں۔ بائیں جانب ہیکن کی ابر سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں ہیں داہنے جانب کچھ فاصلے پر برف کے پہاڑ ہیں۔ بادل گرجتا ہے بجلی چمکتی ہے۔ روڈی ملّاح اپنی جھونپڑی سے باہر نکل آتا ہے۔ ورنی شکاری پہاڑ سے اترآتا ہے۔ کیونی چرواہا اپنے ساتھی سیپی کے ہمراہ دودھ کی بالٹی لئے ہوئے داخل ہوتا ہے)۔

روڈی - جینی! - کشتی کنارے لگاؤ۔ طوفان آیا ہی چاہتا ہے۔

کیونی - ہاں پانی اب برسنے ہی کو ہے۔ دیکھو ہماری بھیڑیں کس شوق سے چر رہی ہیں۔

ورنی - مچھلیاں اُچھل رہی ہیں۔ اور بن مرغیاں غوطے لگا رہی ہیں۔ طوفان ضرور آئیگا۔

کیونی - (اپنے لڑکے سے) سیپی! دیکھ تو مویشی سب نظر آتے ہیں نہ؟

سیپی - وہ بھوری بھیڑ جا رہی ہے۔ اس کی گھنٹی کی آواز میرے کانوں میں آرہی ہے۔

کیونی - تو سب محفوظ ہیں۔ وہ ہمیشہ سب کے آگے رہتی ہے۔

ورنی - کیا یہ تمہاری ہیں؟

کیونی - نہیں میرا اتنا مقدور کہاں! یہ ڈیوک آف اٹنگس کی ہیں اور میری نگرانی میں ہیں۔

روڈی - کس شان سے وہ پٹہ پہنے ہے۔

کیونی ۔ وہ خوب جانتی ہے کہ وہ گلہ کی سرگروہ ہے۔ اس
سے پتہ چھین لو اور وہ چرنا چھوڑ دے گی۔

روڈی ۔ اب تم لگے مذاق کرنے بے عقل جانور میں یہ
خودداری کہاں؟

ورنی ۔ یہ صرف کہنے کی بات ہے ۔ جانوروں میں بھی
عقل ہوتی ہے ۔ اس کو ہم شکاری خوب جانتے
ہیں ہرن اس وقت تک نہیں چرتے جب تک کہ
وہ ایک پہرہ دار نہیں کھڑا کر لیتے ہیں جو ہملوگوں کو
دیکھتے ہی اُن کو خطرہ سے آگاہ کر دیتا ہے۔

روڈی ۔ یہ کون اس بدحواسی سے دوڑا آرہا ہے۔

ورنی ۔ میں اس شخص کو جانتا ہوں ۔ یہ بمگرٹن ہے۔ الزن
کا باشندہ ۔

بمگرٹن ہانپتا ہوا آتا ہے۔

"خدا کے لئے ملاح ......"

روڈی ۔ کیوں کیوں ۔ ایسی کیا عجلت ہے؟

بمگرٹ ۔ جلد کیجئے ۔ میری زندگی خطرے میں ہے۔ مجھے فوراً
اس پار پہنچاؤ۔

کیونی ۔ کہئے ماجرا کیا ہے؟

ورنی ۔ کون آپ کا تعاقب کر رہا ہے۔ آپ اس قدر گھبرائے
ہوئے کیوں ہیں؟

بمگرٹ (ملاح سے) جلدی کرو جلدی ۔ وہ میرے پیچھے ہیں ۔ اگر والیسرے
کے اُن لوگوں نے مجھ کو گرفتار کر لیا تو میں گیا۔

روڈی ۔ کیوں؟ کیا سپاہی آپ کا تعاقب کر رہے ہیں؟

ورنی ۔ ایں ۔ یہ آپ کے لباس پر خون کے دھبے! یہ
کیا معاملہ ہے؟

بمگرٹ ۔ شاہی ناظم جو راسبرگ میں تھا ......

کیونی ۔ کیا اولف شاٹ[1] ! وہ تمہارے تعاقب میں ہے؟

کیونی ۔ ملاح! جلدی کرو اور اس بیچارے کو اس پار اتار دو۔

روڈی ۔ ناممکن! طوفان آیا ہی چاہتا ہے ۔ اس کے
نکل جانے تک توقف کرو۔

بمگرٹ ۔ نہیں! میں رک نہیں سکتا ۔ ذرا سی تاخیر کے
معنی موت ہیں ۔

کیونی (ملاح سے) کھیئو بھی ۔ خدا تمہارا محافظ ہے ہملوگوں
کو اپنے پڑوسی کی مدد کرنا چاہئے ممکن ہے ہملوگوں
پر بھی کوئی برا وقت پڑ جائے ۔

روڈی ۔ آندھی اس زور کی چل رہی ہے ، دریا میں اتنا
تلاطم ہے ، کون اس وقت کھے سکتا ہے؟

بمگرٹ ۔ (اس کے قدموں پر گر کر) میری مدد کرو خدا تمہاری
مدد کرے گا ۔

ورنی ۔ اس کی زندگی خطرے میں ہے ، رحم کرو رحم ۔

نوٹ [1] ۔ اولف شاٹ ، [illegible] ایک شریف خاندان کا نوجوان [illegible] تھا جس نے اسٹریا کے خاندان سے نسبت پیدا کر لی تھی ، وہ قلعہ راسبرگ کا ناظم مقرر ہوا تھا ۔ یہ [illegible]
حرکت پر بمگرٹن کے ہاتھوں قتل کر ڈالا گیا ۔

کیوتی۔ اس کے بیوی اور بچّے بھی ہیں!

(بادل زور سے گرجتا ہے، اور بجلی تڑپتی ہے)

روڈی۔ کیا میرے بیوی اور بچّے نہیں ہیں۔ کیا میری بربادی
سے اُن پر تباہی نہ آئیگی! تم دیکھ رہے ہو کہ لہریں کیسے
بھاپین پھینک رہی ہیں۔ جھیل اپنی سطح سے بانسوں
اوپر اُچھل رہی ہے۔ میں اس مصیبت زدہ شخص کو
ضرور بچاتا بشرطیکہ یہ میرے امکان میں ہوتا۔

بگرٹ۔ تو کیا میں ان ظالموں کے ہاتھ میں گرفتار ہو جاؤں
اور اس صورت میں کہ پُرامن ساحل سامنے ہو۔
میں اس کو صاف دیکھ رہا ہوں۔ میری آواز بھی
وہاں تک پہنچ سکتی ہو کشتی بھی موجود ہو اور پھر بھی
یوں بے دست و پا یہاں پڑا رہ جاؤں۔

کیوتی۔ دیکھو! کون آرہا ہے؟

روڈی۔ یہ ٹل ہے ٹل۔ برگلن* کا رہنے والا۔

ٹل۔ یہ کون شخص ہے جو تم سے مدد کا طالب ہے۔

کیوتی۔ یہ الزٹون سے آیا ہے اور اپنی عزت کو ناظم راسبرگ
کے ناپاک ہاتھوں سے بچانے کے لئے اس نے
اسکو مار ڈالا۔ فوج اس کے تعاقب میں ہے اور
یہ ملاح سے التجا کر رہا ہے کہ وہ اس کو پار
پہنچا دے۔

روڈی۔ اچھا۔ ٹل بھی اتنی خوبی سے کھے سکتے ہیں جتنا کہ
میں۔ یہی انصاف سے کہہ دیں کہ کیا یہ اس وقت
ممکن ہے؟

(بادل زور سے گرجتا ہے اور جھیل زیادہ متلاطم ہوتی ہے)

روڈی۔ کیا میں اپنی جان دینے جاؤں۔ اگر ایسا کروں تو
پاگل ہوں"

ٹل۔ بہادر اپنا خیال نہیں کرتے خدا پر بھروسہ رکھو اور
اس کی مصیبت میں آڑے آؤ۔

روڈی۔ یہاں بیٹھکر صلاح دینا تو بہت آسان ہے وہ
جھیل ہے، اور وہ کشتی، تمہیں جاؤ۔

ٹل۔ جھیل کو رحم آجائیگا لیکن ویسرائے ہرگز نہ چھوڑیگا۔
آؤ اسے خطرہ سے بچاؤ۔

چرواہا اور شکاری۔ ہاں۔ ہاں۔ اسے بچاؤ۔ بچاؤ۔

روڈی۔ اگر میرا بھائی یا لڑکا ہوتا تب بھی میں نہ جاتا۔
آج جھیل کسی نہ کسی کی بھینٹ ضرور لے گی۔

ٹل۔ فضول باتیں کرنے سے کیا فائدہ۔ ایک ایک لمحہ
قیمتی ہے اس کی مدد کرنا ضرور چاہیئے۔ بولو تم مدد
کروگے یا نہیں؟

روڈی۔ نہیں۔

ٹل۔ تو خدا کے نام پر مجھے کشتی دو میں اپنے ان ناتواں

* برگلن، ٹل کا وطن اور جائے پیدائش ہے۔ ۱۵۲۲ء کا بنا ہوا گرجا اسی مقام پر ہے۔ جہاں اس کا گھر تھا۔

بازوؤں سے جو کچھ کر سکتا ہوں کروں گا۔

کیونی ۔ شاباش بہادر ٹل شاباش۔

مگرٹ ۔ ٹل تم میرے فرشتے اور میرے جان بچانے والے ہو۔

ٹل ۔ میں تم کو ویسرلے کے پنجے سے بچا سکتا ہوں
مگر اس طوفان سے بچانے والا دوسرا ہے۔ تاہم
خدا کے ہاتھوں نہ پڑنا ان خونخوار آدمیوں کے
ہاتھ میں گرفتار ہونے سے اچھا ہے (جیدا ہے ہے)
اگر میں نہ بچوں تو میری بیوی کو تسلی دینا۔ میں
اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

(وہ کشتی میں کودتا ہے)

روڈی ۔ ٹل بڑا بہادر ہے۔ اس کاش آج کوئی دوسرا
نہیں دکھائی دیتا۔

ورنی ۔ (جو ایک گھاٹی پر چڑھ گیا تھا) وہ نکل گیا.....
میرے بہادر خدا تیری جان بچائے۔
..... دیکھو تو کشتی
وجوں کے ساتھ.......
کیسے اٹھتی گرتی چلی جا رہی ہے.......

کیونی ۔ اوہ ۔ وہ اب نکل گیا اب نظر سے باہر ہے
..... اب وہ پھر نظر آئی..... دیکھو ٹل اسے بہادری
سے کھے رہا ہے!

(باقی)

سیپی ۔ یہ سوار گھوڑے دوڑائے چلے آ رہے ہیں۔

(سوار داخل ہوتے ہیں)

پہلا سوار ۔ قاتل کو حوالے کر دو۔ وہ تمہارے پاس ہے۔

دوسرا ۔ وہ اسی طرف آیا ہے۔ اس کا چھپانا بیکار ہے۔

روڈی اور کیونی ۔ کس کو دریافت کرتے ہو۔ قاتل سے
مراد تمہاری کس شخص سے ہے؟

پہلا ۔ (کشتی دیکھکر) لاحول ولاقوۃ ۔ یہ میں کیا دیکھ رہا
ہوں۔

ورنی ۔ (بلندی سے) جسے تم ڈھونڈتے ہو وہ کشتی پر
جا رہا ہے۔ اگر گرفتار کرنا ہے تو جلد گھوڑے دوڑاؤ۔

دوسرا ۔ تم پر خدا کی مار ۔ وہ بچ نکلا۔

پہلا ۔ (ملاح سے) چونکہ تم لوگوں نے اس کے نکل جانے
میں مدد کی ہے۔ اس لئے تم لوگوں کو بھگتنا پڑے گا۔
ان کے گلوں کو پکڑ لو۔ ان کی جھونپڑیاں گرا دو۔ ان
میں آگ لگا دو۔

سیپی (بھیڑوں کے پیچھے دوڑتا ہوا) ہائے میرے عزیز میمنے!

کیونی ۔ ہائے میرے مویشی!

ورنی ۔ ظالم!

روڈی (اپنا ہاتھ نکلکر اٹھاتے ہوئے) خدا برحق ۔ اس بدنصیب ملک کو
کب غلامی سے نجات ملے گی اور آزادی نصیب ہو گی۔

حامد جمال

گریۂ مہدی

(حضرت مہدی کے قلم سے)

دھوپ روپوش پسِ بام ہوئی جاتی ہے ۔۔۔ زندگی ختم سرِ شام ہوئی جاتی ہے

زندگی میں تو میسر نہ ہوا مجھ کو سکوں ۔۔۔ موت ہی باعثِ آرام ہوئی جاتی ہے

اک مصیبت تو یہی ہے کہ طبیعت اپنی ۔۔۔ خوگرِ لذتِ آلام ہوئی جاتی ہے

چاہنا ہی تمہیں جب دل کا تقاضا ٹھہرا ۔۔۔ کیوں محبت مری بدنام ہوئی جاتی ہے

دشتِ غربت میں بھٹکتا ہوں بہت دیر سے میں ۔۔۔ راہ ملتی نہیں اور شام ہوئی جاتی ہے

نزع میں مجھ کو اگر فکر کوئی ہے تو یہی ۔۔۔ رخصت اب حسرتِ ناکام ہوئی جاتی ہے

حاصلِ زیست تو ہم خود ہی نہ سمجھے مہدی ۔۔۔ زندگی مفت میں بدنام ہوئی جاتی ہے

سپوت بیٹا

(راماین کا ایک سین)

(پروفیسر بدری پرشاد نگین گوالیاری کے جادو نگار قلم سے)

(مہاراجہ رامچندر جی کے دوست اُن کی تخت نشینی کی خبر سنکر جمع ہوتے ہیں)

گانا۔

چلو مٹھائی رام سے مانگیں بڑی خوشی ہے آج ...... چلو۔

متر کو اپنے سر پہ دسرتھ نے دیا اودھ کا راج ...... چلو۔

(رام کا آنا)

اہا جی اچھے آئے۔ یاروں کو کیا کیا لائے۔ لاؤ مٹھائی لاؤ۔ کھانے کو سن للچائے۔

اُن میں نہیں ہم جلیں دیکھکر بنتا کسی کا کاج ...... چلو۔

رام۔ جیسی مٹھائی چاہو گھر پر سب چل کر کھاؤ۔ کھاؤ اور موج اڑاؤ۔ آؤ اور جلدی آؤ۔

کل کی کسے خبر ہے کیا ہو، موج اڑالو آج ...... چلو۔

گھنشیام۔ "متر جس وقت سے یہ خبر پائی ہے کہ کل تمہیں راج تلک ہوگا، دل ہے کہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔"

رام۔ ہاں ، خوشی تو تم کو ضرور ہوگی لیکن میں اِس وقت سے یہی سوچ رہا ہوں کہ اتنا بڑا بار کس سے اٹھیگا شاید تم سمجھتے ہو کہ راجہ بنکر آنند ہی آنند ہے۔ افسوس تم حقیقت حال سے بے خبر ہو۔

راجہ کے جو دھرم ہیں اور اُن کے مطابق جو کام کرتا ہے اُس سے پوچھو کہ راجہ بننے میں کیا آنند ہے؟ ایک باپ صرف اپنے کنبے کی فکر میں پریشان و سرگرداں رہتا ہے، لیکن راجہ جس کی رعایا اس کا کنبہ اور جس کی قوم اس کا خاندان ہے کس قدر ذمہ داری کا بوجھ اپنے سر لیتے ہے۔ راجہ بنکر جو عیش کے چکر میں پڑجاتے ہیں اور اپنی پرجا کا پالن اچھی طرح نہیں کرتے وہ راج نیتی کے خلاف چلتے ہیں۔

موہن۔ کیوں رام جب تم راجہ ہو جاؤگے تو کیا اس وقت بھی ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے آؤ گے۔

رام۔ متر! یہ سب باتیں فرصت کی ہیں۔ راج کے جھگڑوں میں، اس لطف و آرام کی فرصت کہاں؟

سچ پوچھو تو راجہ اب بنے ہوئے ہیں۔ اپنے وقت کے راجہ، اپنے چین کے مالک، اپنے کام کے مختار، دنیا بھر کے آنند ہم تم آگے چل کر اٹھائینگے۔ مگر اس لطف کے ساتھ پھر آنکھ مچولی نہ کھیلنے پائینگے۔ آؤ آج آخری دفعہ

اور آنکھ مچولی کھیل لیں۔

(رام کی آنکھوں پر پٹی باندھی جاتی ہے اور سب دوست چھپ جاتے ہیں)۔

رام (آنکھوں پر سے پٹی ہٹاکر) واہ واہ ان کھیلوں سے بھی انسان اگر چاہے تو اچھا سبق سیکھ سکتا ہے۔ یہ بچوں کی آنکھ مچولی نہیں ہے، ذرا غور کرو اور سمجھو کہ اس میں کیا بھید پوشیدہ ہے۔ جب تک آنکھیں کھلیں ہیں تمہیں سب کچھ نظر آتا ہے۔ یہ لڑکا ہے یہ لڑکی ہے۔ یہ دوست ہے یہ دشمن ہے۔ لیکن آنکھ بند ہوئی اور پھر نہ لڑکا ہے نہ لڑکی، نہ دوست ہے نہ دشمن۔ سنساری پیڑو! ذرا سے کھیل کے واسطے اس قدر سامان کیوں اکٹھا کرتے ہو۔ کیوں ذرا ذرا سی باتوں پر جان دئے دیتے ہو۔ کچھ اس کی بھی تلاش کرتے جاؤ جو خود چھپا ہوا تمہارے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔ جس طرح اس کھیل میں چور کی آنکھ پر پٹی باندھی جاتی ہے اور پٹی اتار کر وہ اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈھتا ہے اسی طرح اس دنیا میں گو ہم سب کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں مگر سچ پوچھو تو پٹی بندھی ہے۔ ہم میں سے بہت سے ایسے ہیں کہ پٹی باندھے ہی باندھے اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ اور دوسری چیزوں کو ڈھونڈھنے میں وقت گذار دیتے ہیں۔ کوئی روپیہ کمانے کی فکر میں ہے کوئی کما کر رکھ گیا ہے دوسرا اُسے اڑانے کی فکر میں ہے کوئی بڑا آدمی بننا چاہتا ہے۔ کوئی چھوٹے آدمی کو اچھی حالت میں دیکھ کر کڑھتا ہے۔ افسوس ہم ان چیزوں کی تلاش میں اپنا سارا جنم گنوا دیتے ہیں اور اس پٹی باندھنے والے کی تلاش نہیں کرتے۔ میرے بھائیو! جب تک آنکھیں کھلی ہیں تلاش کرلو ورنہ یاد رکھو کہ جس دن آنکھیں بند ہوجائیں گی اُس وقت سوائے افسوس کے کچھ ہاتھ نہ آئیگا۔

(باقی)

ہمارے جوائنٹ اڈیٹر سید صغیر حسن شاہ آسیر جو قید فرنگ سے رہا ہو کر عتبات عالیات کی زیارت کے لئے عراق تشریف لے گئے تھے اور جہاں سے وہ حال ہی میں تشریف لائے ہیں۔ فی الحال اپنے سفرنامۂ عراق کی تکمیل میں سرگرمی سے مصروف ہیں۔ اس سفر کے وہ واقعات جنکا تعلق انکی سیاسی سرگرمیوں سے ہے اور جنکی بدولت انہیں چند دنوں کے لئے قید و بند کی سختیاں جھیلنی پڑیں نہایت دلچسپ ہیں اور برطانیہ کی سیاسیات بین الاقوام پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس دلچسپ سفر کے حالات آئینہ کی تیسری اشاعت میں شائع کئے جا سکیں گے۔

اڈیٹر

خوش آمدید

(بلقیس خاتون صاحبہ کے قلم سے)

شب چو آمد آئینہ بر بام ما
خندہ زد بر صبح روشن شام ما

صبح کی گلابی فضا میں پھولوں کی شامہ نواز نکہت دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ نسیم سحر کی گستاخیوں سے غنچوں کے بند لبوں پر شرارت آمیز تبسم نمودار تھا۔ گلاب کے گلابی لبوں پر صبح کی شبنم کے چمکدار قطرے رقصاں تھے۔ نرگس خواب ناز سے بیدار ہو رہی تھی۔ سنبل پیچاں کی زلفوں کا نوباف کھل رہا تھا۔ یاسمن انگڑائیاں لے رہی تھی۔ لالہ حوض کے آئینہ میں اپنا عکس دیکھکر اپنے ہی عشق میں داغدار ہو رہا تھا۔ موتیا کی لچکدار شاخیں جھوم جھوم کر بارگاہ عبودیت میں سجدۂ شکر ادا کر رہی تھیں۔ رنگا رنگ کے پھول صحن چمن کو گہوارۂ حسن بنا رہے تھے۔

دفعتاً باغ کے ایک گوشہ سے غلغلۂ مسرت بلند ہوا۔ یعنی گلستان ادب و لٹریچر میں ایک نیا پھول کھلا۔ جس کی شگفتگی کے ساتھ پتوں نے تالیاں بجائیں کلیاں ہنسیں مرغان چمن نے نغمائے مسرت گائے اور اور صبا مستانہ وش عنبر فشانی کرتی ہوئی چلی!

ہے غل یہاں ہر چار سو
آتا ہے اب وہ ماہ رو
تھی ہمکو جسکی جستجو
کرتے تھے باہم گفتگو
پیمانہ سے مل کر سبو
سبزہ سے ملکر آب جو
پھولوں سے ملکر رنگ و بو
نسریں سے ملکر نسترن

آ! اے پیارے آئینہ آ

تیرے سینہ میں وہ رنگینیاں مستور ہیں جن سے دنیائے ادب زینت پائیگی۔

خوش آمدی مہماں تو شگفتہ۔!

تو بحر ہند کے بہترین دُر ہائے آبدار اپنے صدف سینہ میں چھپائے ہے۔ سنہرے جذبات نذیں تخیلات اور روح پرور خیالات کے سرچشمہ آ۔ تیرا ایک نظارہ کن رنگین اداؤں سے مملو ہے۔

تو ابھی چپ سا ہے لیکن جب تیرے لب حرکت کرینگے اسوقت ادیب کی آنکھیں تجھے دیدہ و دل میں جگہ دینگی۔ تو ابھی ایک ساز خاموش ہے۔ جس سے نغمائے دلکش نکلنے کی دیر ہے۔

خوش آمدی سحر و اعجاز کے دیوتا خوش آمدی! تیری آرائش و زیبائش فرض ہوگا ان عاشقان ادب کا جنکا

گلریز قلم گلشن ادب کی باغبانی میں مصروف ہے میرے حسین اوراق آراستہ کئے جائینگے۔

اُن آبدار موتیوں سے جنکی درخشانی سے فضائے ادب روشن ہے۔

تیرا سینہ سجایا جائیگا اُن حسین پھولوں سے جن میں شمیم "الفت" کی بو ہوگی خوش آمدی مہمان ادب۔

ہمارا فرض ہے کہ تیرے خیر مقدم میں آنکھوں کا فرش کریں۔

اے شاہد رعنا اسی نگارستان میں بے نقاب ہو اور اپنا حسن پنہاں دکھا۔

آ۔ اے خورشید درخشان اپنی تابش سے افسردہ زردوں میں زندگی کی چمک پیدا کر۔

آ۔ اے بلبل خوش الحان اپنی پُراثر موسیقی سے دلوں کو مسحور کر!

خدا تجھے سرسبز و بامراد رکھے۔ اور تو نشو ونما پاکر شباب کی لذت سے آشنا ہو۔ اور اے گلزار فصاحت!

تیرا باغبان تا قیامت اپنے گوہر ریز قلم سے ادبی جواہر منتشر کرکے گوشۂ ادب کو رشک فردوس بنائے۔

حُسن تو ہمیشہ در فزوں باد ۔ ردیت ہر سال اللہ گون باد

تیری ہی خواہ

ناچیز **بلقیس خاتون**

بنت مولوی عبدالاحد صاحب

غزل

(از حجاب صاحبہ شاہجہاں پوری)

چاہتے ہیں وہ دلدہی دل کی — اب قیامت ہے بیخودی دل کی
عاشقی موت بن گئی دل کی — بجھ گیا دل غضب لگی دل کی
یہ نہ پوچھو کہ کیا ہیں ہجر و وصال — "ایک موت" "ایک زندگی دل کی"
اک زبردست جوش کا عالم — اور افسوس! بے بسی دل کی
اے مسیحا منانے کو آجا — روٹھی جاتی ہے زندگی دل کی
ایک مرضی حجاب نے پائی — موت کی، چرخ کی، تیری، دل کی

قتیل حسرت

(رابعہ خاتون صاحبہ کے قلم سے)

آہ خوش باشد کہ بینم بار دیگر روئے دوست

در سجود آیم بہ محراب خم ابروئے دوست

(۱)

بہار کا موسم قریب ختم ہے، ماہ اپریل آدھے سے زیادہ گذر چکا ہے، اور چونکہ مسوری کا یہ موسم نہایت خوشگوار اور پر فضا ہوتا ہے اور موسم بہار کے خوشنما اور رنگا رنگ کے پھول، خنک ہوا، اور دلفریب نظارے روح کو کیف اور آنکھوں کو پُرنور بناتے ہیں، لہذا اکثر فطرت پرست گرمی شروع ہونے سے قبل ہی یہاں آجاتے ہیں اور فطرت کی گوناگوں دلچسپیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں

شام کا وقت ہے، آفتاب تمام دن سفر کرکے ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح منزل مغرب میں آرام کی تیاریاں کر رہا ہے، تفریح گاہوں میں اس وقت آدمیوں کا ہجوم ہے، اکثر نوجوان ٹہلتے ہوئے اپنی قیام گاہوں سے دور نکل گئے ہیں، سامنے کی سبز گھاس پر آڑووں کے درختوں کے قریب ایک حسین جمیل نوجوان، جسکی عمر تقریباً بیس سال ہوگی، آسمانی رنگ کے ریشمی سوٹ پر ترکی ٹوپی اوڑھے ٹہل رہا ہے۔ اسکے روشن چہرے سے رنج و فکر، اور کشادہ پیشانی سے تردد و پریشانی کا اظہار ہوتا ہے آخر ٹہلتے ٹہلتے وہ خود بخود آہستہ آہستہ اس طرح کہنے لگا۔

آہ! ابا جان نے تو اس مصائب بھری دنیا کو الوداع کہا، مگر میری زندگی تلخ کر گئے۔ افسوس! انکی زندگی نے وفا نہ کی، راہئ ملک بقا ہوئے اور مجھ بدنصیب کو اپنا غم جھیلنے کو چھوڑ گئے اے کاش میں اُن سے پہلے دنیا سے گذر جاتا اور یہ صدمہ نہ اُٹھاتا۔ اے خدا تو مجھکو بھی دنیا سے اُٹھالے۔ (رومال سے آنسو پونچھ کر) آہ اُنکی وفات سے میری تعلیم میں کیسا رخنہ پڑا! افسوس وہ کس شوق سے مجھے لندن بھیجنے کی تیاریاں کررہے تھے، مگر۔ ع

"اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"

(آسمان کی طرف سر اُٹھاکر) یا خدا! مجھ بدنصیب پر رحم کر!"

یہ کہکر اُس نے جیب سے ایک سوتی رومال نکالا اور دونوں ہاتھ آسماں کی طرف اُٹھائے۔ اور کہنے لگا۔ اے میرے حقیقی مالک! اے پاک خدا! مجھکو صبر و استقلال عطا کر۔ اپنی رضا پر

شاکر رکھ۔ مجھکو توفیق دے کہ تیرے احکام کی خلاف ورزی نہ کروں۔ ان جھگڑوں کو بہ طریق احسن طے کردے جو آجکل مجھے تکلیف دینے کا باعث ہو رہے ہیں"۔ رومال سے آنسو خشک کئے۔ اور سر اٹھایا۔ سامنے نظر گئی تو آنکھیں جھپک کر بند ہو گئیں۔

"درختوں میں آفتاب نیم روز جگمگا رہا تھا"

ایک منٹ بعد آنکھیں کھول کر غور سے دیکھا۔ ایک پندرہ سالہ لڑکی بنارسی ریشم کی کاسنی ساری اور بسنتی رنگ کا بلاؤس زیب بدن کئے کھڑی غور سے اسکی حالت دیکھ رہی تھی انکھیں چار ہوتے ہی وہ جھجکی۔ اور کچھ محجوب سی ہو کر آہستہ آہستہ جھاڑیوں میں چھپ گئی۔

"اب درختوں میں اندھیرا ہو گیا"

نوجوان غور کرنے لگا کہ "یہ کیا تھی جسکے پر تو سے پہاڑ کا گوشہ گوشہ منور و روشن تھا اور جسکے ہٹتے ہی اندھیرا ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب اسی کے بالۂ نور سے کسب ضیا کر رہا تھا کیا یہ کوئی آسمانی فرشتہ تھا یا اسی ارض خاکی کا انسان! نہیں انسان تو کبھی نہیں ہو سکتا!" سر اٹھایا تو آسمان پر ستاروں کی محفل آراستہ ہو چکی تھی۔ اٹھ کر آہستہ آہستہ شہر کی طرف رخ کیا۔

(۳)

سیٹھ اسمعیل ابراہیم جی ملک التجار پونا کی اچانک وفات سے اُنکے اکلوتے نوجوان فرزند فیروز ابراہیم جی پر کوہ غم ٹوٹ پڑا اس ناگہانی صدمہ نے کم عمر فیروز کے حواس بجا نہ رکھے۔ سب سے زیادہ فکر اوسے یہ تھی کہ اب اُسکا سول سروس کی تعلیم کے لئے لندن جانا بہت مشکل ہو گیا۔ اعزا میں اُوسے کوئی ایسا نظر نہ آتا تھا جس کے سپرد وہ باپ کا کاروبار کرتا اسی پریشانی میں چند روز گذر رہے تھے کہ اپریل کے مہینے میں اُسکا سوری آنا ہوا جہاں اُسکی ملاقات مسٹر قاسم جی سیٹھ بمبئی کی صاحبزادی ملکہ شیریں جمشید جی سے ہو گئی۔ اور ایک فوری قوت کشش نے دونوں کے دلوں کو ایک دوسرے سے منسلک کر دیا اور دونوں کے دلوں میں محبت کی شعاع ضوفگن ہو گئی۔ شیریں جمشید جی نے اپنے معزز والد مسٹر قاسم جی سے فیروز کی مشکلات کا ذکر کیا۔ انھوں نے بلا تامل اُسکے کارخانہ کی سرپرستی کا وعدہ فرمالیا۔ اور اب بظاہر فیروز مطمئن ہو کر ولایت جانیکی تیاری کر رہا ہے۔ لیکن باطن میں اُسکے قلب کو اطمینان حاصل نہیں اُسکی آنکھوں کے سامنے ہر وقت نور کی ایک جھلک رقص کرتی ہے، اُسکے دماغ میں ہر لحظہ ایک خیال چکر کھاتا ہے اُسکا دل کسی وقت مسرور نہیں ہوتا" شیریں کو بھی راحت قلبی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ متفکر اور پریشان نظر آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ کسی گہری فکر میں ہے۔

(۲۳)

صبح کا وقت ہے سیٹھ قاسم جی اپنی لائبریری میں تشریف رکھتے ہیں۔ انھوں نے ایک مرتبہ سر اٹھایا۔ سامنے بیرا مؤدب کھڑا تھا۔

سیٹھ صاحب "کیا ہے؟"

بیرے نے فوراً سلام کرکے لفافہ پیش کیا۔

سیٹھ صاحب۔ نے خط چاک کرکے پڑھنا شروع کیا۔

سیوائے ہوٹل ستمبر ۱۵

مخدومی و محتشمی جناب سیٹھ صاحب قبلہ

پس از آداب غلامانہ عارض ہوں کہ پہلے تو خاکسار جناب کے گوناگوں احسانوں کا شکریہ ادا کرکے اپنی جسارت کی معافی چاہتا ہے۔ پھر دھڑکتے ہوئے دل سے یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہے۔ کہ ......

کیا میں جناب کی ...... گوناگوں شفقتوں سے یہ امید کرسکتا ہوں کہ جناب مجھکو اپنی فرزندی میں قبول فرمائیں گے اور اپنی دختر بلند اختر ملکہ شیریں جمشید جی کا رشتۂ زندگی میرے ہمراہ وابستہ کرکے مجھے خوش نصیب بنائیں گے

معافی کا خواستگار

فیروز ابراہیم جی

ستمبر کے آخر میں پہاڑوں سے واپسی ہوئی۔ سیٹھ صاحب نے فیروز کی درخواست منظور فرمالی۔ اور اب وہ لنڈن جارہے ہیں۔ روانگی سے ایک روز پیشتر سیٹھ صاحب کے یہاں ڈنر تھا۔ ہر طرف خوشی و مسرت جلوہ گر تھی۔ لوگ اس رشتہ کو رشک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ مبارکبادیوں کے ڈھیر لگ گئے تھے۔ فیروز نے سنہرا چھلا قبل از وقت شیریں کو پہنا دیا۔ اور ایک رومال جس پر یہ تحریر تھی "تاکہ تمکو میری یاد رہے" اُسکے گلے میں باندھ دیا۔ اور ہاتھ ملاکر گاڑی پر سوار ہوگیا۔ دوسرے روز ساحل بحر پر آدمیوں کا ہجوم تھا۔ اعزا و احباب فیروز کو جہاز پر سوار کرنے آئے تھے۔

دوستوں سے رخصت ہوکر فیروز جہاز پر گئے۔ یہاں شیریں اور سیٹھ صاحب سے بھی رخصت ہوئے۔ شیریں کے گلابی رخساروں پر آنسو ڈھلکتے دیکھکر فیروز کو انتہائی صدمہ ہوا۔ لیکن اُس نے ضبط سے کام لیا۔ اور آنسو پی کر کہنے لگا۔

شیریں یہ موقعہ رنج و غم کا نہیں ہے۔ دعا کرو! خدا مجھکو ولایت سے کامیاب واپس لائے۔ اور میری آنکھیں اس منور چہرہ کو پھر ہنستا ہوا دیکھیں"۔ شیریں نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"خدا حافظ"

"بہ سفر رفتنت مبارک باد   بہ سلامت روی و باز آئی"

جہاز حرکت میں آیا۔ اور شیریں کشتی میں بیٹھ کر کنارے آگئی۔ ایک تیز سیٹی ہوئی۔ تہذیب انجن کے ہیبت ناک پرزے متحرک ہوئے اور فیروز ساحل بمبئی پر آخری حسرت بھری

نظریں ڈال کر روانہ ہو گئے۔

(۴)

نہ دی زمانہ کو گردش نے ایک دم مہلت
ہر ایک سانس قدم ہے رہِ فنا کے لئے

فیروز کو کیمبرج میں تعلیم پاتے ایک سال ہو گیا۔ اس عرصہ میں اسکی زندگی کا سہارا صرف شیریں کی تحریر تھی۔ جس سے اُسکے تخیل میں امید کی کرن چمک جایا کرتی۔ اور وہ ایک پُرمسرت و پربہار زمانہ کے شیریں تصور میں کھو جایا کرتا۔

شام کا وقت ہے۔ فیروز معہ اپنے ہم وطن اور دوست اختر کے دریا کی سیر کر رہا ہے۔ یکایک بیرا سامنے آیا۔ اور تار پیش کیا۔ فیروز نے لفافہ چاک کیا اور تار کے آتشیں الفاظ پر نظر ڈالی۔ اُسکی آنکھوں میں اندھیرا آیا۔ وہ چکرا کر بیٹھ گیا۔ اختر نے بڑھ کر تار لے لیا۔ اور پڑھنے لگا "سیٹھ قاسم جی کی بیماری نے ترقی کی۔ اور وہ گذشتہ جمعہ کی شب کو انتقال کر گئے"

ایجنٹ مہدی

اختر نے اظہار افسوس کیا۔ اور فیروز کی تسلی کرنے لگا
فیروز گرتا پڑتا مکان آیا۔ اور کمرہ میں جاکر دروازہ بند کر لیا
پہلے تو آرام کرسی پر گر کر خوب دل کی بھڑاس نکالی۔ پھر آنسو پونچھ کر میز کے قریب آیا۔ تھوڑی دیر سر پکڑے کھڑا رہا۔ پھر یکایک چونکا۔ "آہ غم نصیب شیریں ..... تجھکو کن الفاظ میں پرسا لکھوں۔ اے کاش میں وہاں موجود ہوتا! خدا جانے شیریں کا کیا حال ہوگا۔ خدانخواستہ کہیں علیل نہ ہو گئی ہو" یکایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ قلم دوات نکالا۔ اور خط لکھنا شروع کیا۔

نازآفرین شیریں

مجھے ابھی ابھی بمبئی کے تار سے اطلاع ملی (اور کسطرح لکھوں) کہ سیٹھ صاحب نے بعد طویل علالت اس دارفانی کو الوداع کہا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور تمہارے بیقرار دل کو تسکین عطا فرمائے۔

اگرچہ میں جانتا ہوں کہ تم پر رنج و غم اور بیکسی کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ لیکن شیریں برائے خدا اپنی طبیعت کو سنبھالنے کی کوشش کرنا۔ خدا کی مصلحتیں انسانی سمجھ سے بالا ہیں۔ اور تم جانتی ہو کہ ہماری زندگی کا مقصد فنا ہے۔ تم عقلمند اور فہمیدہ ہو۔ تمکو نصیحت کرنا گویا آفتاب کو شمع دکھلانا ہے۔ تاہم اتنی استدعا کرتا ہوں کہ تم خدا کی مرضی پر صابر ہو کر اپنی طبیعت بہلانیکی کوشش کرو۔ اس بُرے وقت میں اور زیادہ کیا لکھوں۔

فقط شریک غم فیروز

سیٹھ صاحب کی وفات بھولی بھالی شیریں کے حق میں ستم تھی۔ اس حادثہ جانکاہ پر اُسے سکتہ سا ہو گیا۔ اور

وہ اپنے شفیق باپ کے غم میں بیمار ہو گئی - اعزا تو کچھ دنوں بعد یکے بعد دیگرے رخصت ہو گئے تھے - البتہ شیریں کے رشتہ کے ماموں نے (جو جاپان میں تجارت کرتے تھے اور وفات کی خبر سن کر آ گئے تھے) شیریں کی تسلی، دلدہی اور علاج میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا۔ سیٹھ صاحب کا کاروبار اپنی نگرانی میں لے لیا - اور اس رنج و غم کے وقت میں یہ یار و مددگار شیریں کے غم خوار بنے - چند روز تک جب شیریں کو کسی طرح صحت نہ ہوئی - تو آخر ڈاکٹروں کی راے سے۔

اسے ایک سنی ٹوریم میں لے گئے - یہاں اُسکی حالت کچھ سنبھلی اور وہ کسی قدر تندرست ہو کر کچھ عرصہ بعد اپنی کوٹھی واپس آ گئی - اس تنہائی میں اُسکی رفیق دو چیزیں تھیں - اول اُسکی عزیز سہیلی فیروزہ - جس نے اپنا آرام و چین اُس پر قربان کر دیا تھا - دوسرا فیروز کا خط - جس سے اُسکا دل بہت کچھ بہل جاتا تھا۔

سیٹھ صاحب کی وفات کو نو ماہ کا عرصہ گذر چکا ہے - اگرچہ اب شیریں تندرست ہے - لیکن وہ پہلا سا مسرت بھرا دل اور بارونق چہرہ کہاں - صبح کا وقت ہے - برآمدے میں ایک کرسی پر شیریں تپائی پر پاؤں رکھے ہوئے بیٹھی ہے سر کو ہاتھوں کا سہارا دے رکھا ہے - آبی ساری کا آنچل سر سے ڈھلک گیا ہے - اور حسین آنکھوں میں آنسو جھلک رہے ہیں - یکایک کسی نے اُسکے سر پر ہاتھ رکھا - اور ساتھ ہی آواز آئی "پیاری شیریں کیا کر رہی ہو؟" شیریں نے چونک کر سر اُٹھایا - سامنے محبت کی مورت فیروزہ کھڑی تھی - فیروزہ نے بڑھ کر اُسکے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے - اور متفکر نظروں سے اُسکا چہرہ دیکھکر کہا "کیوں کیسی طبیعت ہے؟" شیریں کے آنسو مچل مچل کر پلکوں کے پردوں سے نکل آئے - فیروزہ یہ دیکھکر بے چین ہو گئی - اپنے رومال سے آنسو پونچھے اور کہا "پیاری بہن یہ کیا ہے؟ مجھے بھی تو بتاؤ -

شیریں - (رک رک کر) آہ فیروزہ ! - کیا بتاؤں -

تمھیں تو - معلوم ہی ہے کہ - پانچ مہینے سے - فیروز کا خط نہیں آیا . . . . . میں نے خط لکھے تار دئے - مگر جواب ندارد - آخر مجبور ہو کر فیروز کے دوست اختر کو دریافت حال کے لئے - خط لکھا - لیکن اُنھوں نے بھی جواب نہ دیا - خدا جانے کیا بات ہے - آج میری طبیعت بہت زیادہ بیقرار ہے "

فیروزہ "اتنا رنج نہ کرو - انشاءاللہ آجکل میں جواب آجائیگا"

اتنے ہی میں لڑکے نے ڈاک لاکر میز پر رکھی - فیروزہ نے ایک لفافہ چاک کیا - اور پڑھنے لگی - کیمبرج یونیورسٹی -

محترمہ ملکہ شیریں صاحبہ - پس از سلام مسنون -

عریضہ نگار ہوں کہ آپ کا مکرمت نامہ ناچیز کے نام آیا - آپنے فیروز کے متعلق جو استفسار کیا ہے - اُسکا جواب میرے قلم سے نہیں لکھا جا سکتا - مگر چونکہ یہ ایک جرم ہوگا کہ آپکو

حقیقت حال کی اطلاع نہ کروں۔ لہذا مجبوراً لکھتا ہوں
افسوس ہے فیروز بھی آخر کار اس طلسم خانۂ فرنگ میں گرفتار
ہو ہی گئے۔ خدا جانے کیا انقلاب ہوا کہ اُنکا دل آپ کی
طرف سے پھر گیا اور اب اُنکے قلب و دماغ پر ایک مہوش
فرنگ کی صورت کا نقش بیٹھ گیا ہے۔ مجھے یقین ہے
جلد ہی شادی بھی ہو جائیگی۔ آپکا خیر طلب اختر"
شیریں کے لبوں سے ایک چیخ نکلی، وہ فیروزہ کی گود میں
بیہوش تھی۔ اور وفا شعار فیروزہ کی آنکھوں سے غصہ
کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ (باقی آیندہ)

عاصیہ بنت ثانی مولوی عبدالاحد صاحب

قصیدۂ تہنیت

"یہ قصیدہ" جمالؔ آرا خاتون کی فکر جمیل کا نتیجہ ہے۔ جو خاتون موصوف کی خداداد قابلیت اور فطری ذہانت کی ایک حیرت انگیز مثال ہے۔ از منہ متوسطہ میں تو بہت سی مسلمان خواتین فن شعر گوئی میں کامل اور علم و ادب کی علمبردار گذری ہیں۔ لیکن آج بھی جب کہ پردہ اور رواج کی سخت قیدوں نے انکی دماغی قوتوں کو مضمحل اور مردہ کر دیا ہے۔ چند ہستیاں ایسی موجود ہیں جنکا علمی ذوق اور ادبی شہرت ایک ناشگفتہ کلی کی خوشبو کی طرح استبداد کی چار دیواریوں میں محدود ہے۔ یہ نظم ثبوت ہے اس امر کا کہ مسلمانوں کی پست حال قوم اب بھی ایک سروجنی نائیڈو پیدا کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ قدامت پرستی اور تعصب اسے اسکا موقعہ دے۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ خاتون موصوف کی عمر ابھی صرف ۱۴ سال کی ہے

اڈیٹر

پھر بہار آئی چمن میں بنگئے بوٹی کی دُلہن
ارغواں رنگ کی جوہی پوشاک زیب بدن

کھیلتی پھرتی ہے لہروں پہ کرن سورج کی
خندہ زن جوش مسرت میں ہیں گلہائے چمن

ڈالیاں فصل بہاری کو دعائیں دے کر
غنچہ و گل سے بھرے لیتی ہیں اپنے دامن

محو سیر رُخ لالہ ہے گرو ہل کا ہر پھول
چشم نرگس کا اشارہ ہے کہ "ہاں تیر بزن"

منتشر نہر پہ ہیں گیسوئے عشق پیچاں
غوطہ زن آب میں ہے مار کی کالی پلٹن

آئینہ خانۂ عالم کی جو رنگت بدلی
جلوہ افزا ہو آئینہ بطرز احسن

تہنیت آفریں ہے تیری الوالعزمی پر
تو نے اس شہر میں پھیلائی شعاع روشن

منتظر دیر سے تھی تیری یہ مشتاق جمالؔ
شکر خالق کہ ہوا آئینہ تو جلوہ فگن

جمال آرا خاتون متخلص بہ جمالؔ

حسن تخیل

ذیل کی جذبات سے معمور اور پرکیف غزل جناب خورشید بہو بیگم صاحبہ بدرؔ نے سیالکوٹ سے راجہ پور کے مشاعرہ کی طرح میں کہہ کر ارسال فرمائی - جو چند در چند وجوہ سے اس مشاعرہ میں پڑھی جاسکی اس زمین میں اتنے پر لطف شعر نکالنا اور ایسی کامیاب غزل کہہ لینا انہیں کا حصہ ہے - ہم بیگم صاحبہ موصوفہ کو ان کی کامیابی پر اپنی دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں

ایڈیٹر

میں نے رو کر جب کہا رحم اب خدارا کیجئے ۔۔۔ ہنس کے فرمایا نہ اب میری تمنا کیجئے
میں نے پوچھا کسطرح کاٹوں یہ راتیں ہجر کی ۔۔۔ ہنس کے فرمایا دل مضطر سنبھالا کیجئے
جب کہا میں نے کہ حسرت ہے خدنگ ناز کی ۔۔۔ ہنس کے فرمایا کہ ایسا دل تو پیدا کیجئے
جب کہا میں نے سناؤں کچھ دل مضطر کا حال ۔۔۔ ہنس کے فرمایا یہاں محشر نہ برپا کیجئے
جب کہا میں نے یہ آنکھیں ہیں کہانی درد کی ۔۔۔ ہنس کے فرمایا ہمیں اتنے نہ دیکھا کیجئے
جب کہا میں نے نہیں کیوں ان نگاہوں میں اثر ۔۔۔ ہنس کے فرمایا کہ دل میں درد پیدا کیجئے
میں نے پوچھا ماجرا کس سے شبِ غم کا کہوں ۔۔۔ ہنس کے فرمایا ستاروں کو سنایا کیجئے

جذب صادق

(بیگم صاحبہ ناظر حسن صاحب کے قلم سے)

(۱)

اسی سے پوچھئے الفت میں ہوتی ہے کشش کیسی ۔۔۔ مہ کنعاں کو جس نے مصر کے بازار میں دیکھا

آے خوبصورت لڑکی کیا تو ہمیشہ اپنی ضد پر قائم رہیگی؟

یہ الفاظ ایک عالیشان اور پر فضا کوٹھی کے ایک وسیع کمرے میں گونجتے سنائی دیے۔

"ہاں ہاں۔ میں آپ سے بارہا کہہ چکی۔ آپ مجھکو زیادہ مجبور نہ کریں۔ بہتر تو یہ ہے کہ آیندہ آپ میری ملاقات کا خیال بھی دل میں نہ لائیں"

"شانتی تو اپنے حسن پر مغرور ہے۔ تیرا تکبر مجھکو مجبور کرتا ہے کہ میں تیرا خیال دل سے نکال دوں۔ مگر تیرا حسن وہ حسن جس پر تو مغرور ہے وہ حسن جس نے تجھکو سرکش بنا رکھا ہے، میرے ارادوں پر خاک ڈال دیتا ہے لیکن اے حسن کی مغرور اور سرکش دیوی! یاد رکھ کہ میں تیرے حسن و ناز آفرینی کا تنہا قدردان ہوں۔ شیام تجھے دھوکا دے رہا ہے، تجھے جلد معلوم ہو جائیگا کہ ہم دونوں میں کون سچا طالب اور کون محض فریب سے کام لے رہا ہے۔

شانتی۔ "بس بس! گنیش ......

اب حد ہو چکی۔ مجھ سے زیادہ محبت نہ جتاؤ، میں تم اور تمھاری محبت دونوں سے واقف ہوں!

شیام سنگھ کا حسین نام اب اپنی زبان سے نہ نکالنا! میں تم سے آخری مرتبہ کہتی ہوں کہ شیام کے سوا اور کوئی اس دل کا مالک نہیں ہو سکتا جان جائیگی مگر شیام کی محبت نہیں جائیگی۔ بس اب آپ تشریف لے جائیں"

گنیش۔ "تو یہ آخری فیصلہ ہے"؟

شانتی۔ "ہاں۔ آخری"!

گنیش۔ "مغرور لڑکی! ۔ کیا تجھکو معلوم نہیں کہ میں ایک پولیس افسر ہوں اور میرا انتقام تیرے اور شیام دونوں کے لئے سخت خطرناک ہوگا"؟

شانتی۔ "بیشک معلوم ہے۔ مگر یہ باتیں میری اور شیام کی پاک محبت میں فرق نہیں پیدا کر سکتیں"

گنیش۔ (غضبناک لہجہ میں) بہتر! اچھا آخری سلام۔ مگر یہ نہ سمجھنا کہ میرا آخری سلام بھی تمھارے کان سنینگے اور پھر شیام کی آواز بھی"

گنیش یہ کہتا ہوا غصہ کی حالت میں کمرے سے نکل گیا۔

(۲)

ہائے! شیام کو میری آنکھوں سے اوجھل ہوئے آج دو مہینے ہو گئے۔

آہ! کیسی منحوس گھڑی تھی جب کمبخت گنیش نے بدشگونی کے کلمات زبان سے نکالے تھے۔

افسوس یہ کمبخت خدا جانے کہاں سے میرے پیچھے پڑ گیا۔ وہ کونسی گھڑی تھی جب اس نے پتاجی کے پاس مجھکو بیٹھے دیکھا۔ ہائے پتاجی نہیں جانتے تھے کہ یہ دوستی کے پردہ میں دشمنی کریگا۔ پتاجی تو مدت ہوئی مجھکو اپنی پسند کی شادی کرنیکی اجازت دے چکے ہیں۔ پھر بھلا انکو یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ یہ ظالم میرے

دل پر جبر کرے۔ اگر اُنکو معلوم ہوتا کہ گنیش میرے ساتھ یہ سلوک کریگا تو کمبخت کو کبھی اپنے پاس پھٹکنے بھی نہ دیتے۔ آہ! میرے پتاجی بالکل سیدھے ہیں۔ اُنھوں نے اس بات کو بغیر سمجھے گنیش سے دوستی بڑھا کر میرے حق میں کانٹے بوئے۔

افسوس! وہ میرے قسمت برباد کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ میرے شیام کو مجھ سے چھڑا دیا۔ اُف گنیش کے وہ ہولناک الفاظ کانوں میں اب تک گونج رہے ہیں! ہائے کیا سچ مچ اب میں شیام کی آواز نہ سنونگی؟

اُف! اُف! کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اے پرمیشور اب میں کسطرح زندہ رہونگی؟

کچھ پروا نہیں۔ اگر شیام مجھ سے چند گھنٹے اور گم رہا تو میں بھی خود کو گم نام کردونگی۔ خاک چھانکر جس دنیا میں وہ ہوگا وہیں آپ کو بھی پہونچا دونگی۔" یہ الم ناک خیالات شانتی اُن چند درختوں کو سنا رہی تھی جو اُسکے سامنے شام کی تاریک فضا میں سکوت مجسم بنے کھڑے تھے۔ مکان دلکشا اور باغ پُر فضا تھا مگر شانتی اپنے دل کے ساتھ سب کو ویران سمجھ رہی تھی، تر و تازہ پھولوں پر بھی اسکو ایک حسرت ناک اُداسی چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ طیور کی خوش الحانی میں بھی اُسکو نغمہ الم سنائی دیتا تھا۔ اسکی آنکھوں سے اشک جاری تھے اور دل وفور الم سے پاش پاش ہو رہا تھا۔ اُس نے مخملی آرام کرسی کے دستے پر اپنی پیشانی ٹیک دی۔ اور غم و اندوہ کے عمیق سمندر میں غرق ہوگئی۔

زمین پر پڑے ہوئے پاؤں کو کسی نے اُٹھا کر گود میں رکھ لیا شانتی نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اور پھر بند کر لیں۔

"حضور کی طبیعت ناساز ہے۔ تمام جسم ٹھنڈا ہو گیا ہے! مزاج عالی کو اسوقت اسطرف متوجہ ہونا پسند نہیں لیکن خادمہ کچھ عرض لیکر حاضر ہوئی تھی"

یہ فقرے سنکر شانتی ایک آہ سرد کے ساتھ اُٹھی ناتواں لہجہ میں کہا "کیا ہے؟"

"حضور کے پتاجی نے بلانے کے لئے بھیجا تھا مگر حضور کی حالت تو اسوقت چلنے کی متحمل نہیں معلوم ہوتی"

شانتی۔ "نہیں میں چلونگی"

یہ کہکر عورت کے شانہ پر ہاتھ رکھکر اُٹھی اور ساری کا آنچل درست کرتی ہوئی برآمدہ کی سیڑھیوں سے آہستہ آہستہ اُتری۔ روشوں پر ہوتی ہوئی برآمدہ اور کمروں کو طے کرتی ہوئی باپ کے کمرے میں پہونچی۔ شانتی کی صورت دیکھتے ہی غمگین باپ نے درد بھری آواز میں کہا۔

"آہ! بیٹی یہ کیا حالت بنائی ہے، اپنے اوپر نہیں تو اپنے بوڑھے باپ پر رحم کرو"

شانتی نے آنکھیں نیچی کرکے جواب دیا۔

"پتاجی! اب مجھکو اپنے دل پر قابو حاصل نہیں رہا۔"

ہاں آپ کی کوششوں کا کیا نتیجہ ہوا ؟"

باپ :" میں نے اسوقت تمھیں اسی لئے بلایا تھا
ہر طرح کی کوششیں کی گئیں اور ہر چند تلاش کی گئی مگر
شیام کا سراغ نہ ملنا تھا نہ ملا۔

شانتی :" گنیش بھی جب ہی سے غائب ہے ؟"

باپ :" ہاں"

شانتی :" پتاجی آپ مجھکو معاف فرمائیں۔ اب میں
یہاں نہیں ٹھہر سکتی "

باپ :" بیٹی۔ کیا کہتی ہو ؟ صبر سے کام لو، دیکھو پرمیشور
کیا کرتا ہے "

شانتی :" آہ شیام مجھ سے جدا کر دیا گیا۔ ایشور جانے زندہ
بھی ہے یا نہیں یہ کہتے کہتے شانتی کے ہونٹ سفید پڑ گئے
اور وہ غش کھا کر گر پڑی۔

(۳)

"آہ ! اے گم گشتہ۔ تو نے کونسی دنیا پسند کر لی۔
کونسی سرزمین تیرے دل کو بھا گئی۔"
آہ ! تو کیوں مجھ سے متنفر ہو گیا۔ میں نے کیا بیوفائی کی
جو تیرا نازک دل مجھ سے بیزار ہو گیا۔
آہ ! تو کہاں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اگر تجھکو کسی جنگل کی ہوا
موافق آگئی ہے تو کوئی جنگل نہیں چھوٹا جسکی میں نے خاک
نہ چھانی ہو۔"
اگر تجھکو کسی پہاڑ کی فضا مرغوب ہو گئی ہے تو کوئی پہاڑ
نہیں باقی جس پر میں نے تیری جستجو نہ کی ہو" !
مگر اُف ری ناکامی ! آہ ری قسمت۔ تو گم ہے اور
ایسا گم ہے کہ ہوا بھی تیری خوشبو مجھ تک نہیں پہونچاتی۔
میں نہیں جانتی کہ اب تک کتنی برساتیں آئیں اور گذر
گئیں مگر آہ ! او گم گشتہ تیرا پتہ نہ ملنا تھا نہ ملا" !!

ایک اُجاڑ ویرانہ میں شانتی گھاس پر بیٹھی ہوئی مجنونانہ
انداز سے یہ باتیں کہہ رہی تھی

یکایک اس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے
اور کہنے لگی :" اے پرمیشور ! مجھ سے ایسی کیا خطا سرزد ہوئی
ہے جسکی پاداش میں تو نے میرے شیام کو مجھ سے چھین لیا۔
بس ! اب میں اپنی سزا کو پہونچ چکی ! میرے گناہ معاف
کر دے۔ میرے قصور سے درگذر۔
شیام کی صورت مجھکو دکھا دے۔
اُسکی خوشبو سنگھا دے۔
اسکے قدموں تک پہونچا دے۔
اُسکی آواز کانوں کو سنا دے۔
میرا گوہر مقصود مجھکو دیدے۔

آخری الفاظ ادا کرتے کرتے وحشت طاری ہونے لگی
اور وہ مجنونانہ انداز سے دونوں ہاتھ پھیلا کر جھاڑیوں میں گھس گئی

(باقی) "آمنہ خاتون"

قطعۂ تاریخ اجراء رسالہ آئینہ

نکلتا ہے سورج کب اس آن سے — کہ چمکا ہے آئینہ جس شان سے
اڈیٹر ہیں اسکے جناب وحید — رئیس کڑا ا ابن سید فرید
جوائنٹ اڈیٹر جناب صغیر — ہے مشہور جنکا تخلص اسیر
خدا سے ہماری یہ ہے التجا — کہ برآئے ان دونوں کا مدعا
رسالہ زمانہ میں روشن ہو خوب — نہ یہ آفتاب ادب ہو غروب
پھلے اور پھولے یہ فرخندہ فام — زمانہ میں پھیلے بہت اس کا نام
ہوئی فکر پنہاں کو تاریخ کی — کہا "ظل آئینہ اسکندری"

(عاصیہ ۔ ر ۔ خ)

غزل

(از بنت سید نبی اللہ بیرسٹرایٹ لا)

برائے سیر گلستاں کبھی جو تو نکلے — تو پیشوائی کی خاطر گلوں سے بو نکلے
اگر دماغ فلک پر نہ ہو حسینوں کا — کبھی چمن سے نہ آوارہ ہو کے بو نکلے
خدا کا شکر اوٹھائی نہ منت سوزن — نہ میرے زخم جگر قابل رفو نکلے
میں قتل ہونے پہ طیار ہوں یہ خوف ہے — وہ ڈر نہ جائیں گلے سے اگر لہو نکلے
وہ سینہ چھلنی کیا ناوکوں نے اے مخفی — کہ دل کے زخم نہ پھر قابل رفو نکلے

خاتون جنت
المتخلص بہ مخفی

ذیشان

امیر تیمور صاحبقراں نے اپنے زمانہ کے بہترین اطبأ
کی ایک مجلس سے جو نسخہ اپنے لئے طیار کرایا تھا اور جس سے
وہ عیش و نیاوی سے خوب بہرہ ور ہوا تھا اسکی
نقل ایک قدیمی بیاض سے ملی اور زمانہ کے تفاوت
اور ملکی آب و ہوا کا خیال کرتے ہوئے ہمنے اسکو طیار
کرایا ہے اور اپنی انتہائی احتیاط کو کام میں لاکر یعنی تجربہ
اور معاملہ کے بعد ہمکو اسکے کہنے کا موقع ملا ہے کہ یہ
معجون مقوی دماغ مقوی معدہ۔ مقوی باہ اور جملہ
اعضاء رئیسہ کو تقویت پہونچا کر اختلاج کو رفع کرتا ہے
چہرہ کا رنگ چند دنوں کے استعمال سے شاداب اور ہر
درجہ کی کمزوری بلا استعمال طلاء و تکمید دور کرتا ہے۔ یہ
عورتوں کیلئے بھی بہت مفید ہے۔ سیلان الرحم اور بے اولادی
کی شکایت کو دور کرتا ہے قیمت دس خوراک ۲ر روپے۔
چالیس خوراک عـــہ

اسکے فوائد کے متعلق ہزارہا اسناد ہیں جو آپکی نظر سے بعد
چندے گذرینگے اگر آپکو ہمارے دعوے کے مطابق اسمیں
فائدہ نہو تو آپ بلا پس و پیش اسکو واپس کردیں اور ہم
اسکی قیمت واپس کردینگے۔ اور اگر فائدہ ہو تو آپ اسکے
بارہ میں اپنے احباب میں کوشش اشاعت و خریداری
کیجئے یہ وہ چیز ہے جو ہمکو سالہا سال کے تجربہ
اور سیاحت کے بعد ملی ہے اب اگر آپ اسکی قدر کریں
تو ہماری حوصلہ افزائی ہو۔

ملنے کا پتہ ایس۔ ایم بہادر اینڈ کمپنی چوک لکھنؤ۔

خدا کی کتاب

حالات قومی اور کشاکش ملی میں صرف قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جو مردہ
قوموں اور شکستہ حال ملکوں کو پھر مضبوط اور تازہ دم کرسکتی ہے اسکے ترجمہ کو
نئی ترکیب سے پیش کیا ہے یعنی سپارہ عم اور پارہ اول کو لفظاً الگ الگ لکھا گیا ہے
اور اسکے آگے اسکا اردو ترجمہ دیا گیا ہے گویا لغات قرآنی پر عبور حاصل کرنے
اور ترجمہ یاد کرنیکا اچھا ذریعہ پیدا کیا گیا ہے۔ خصوصاً ابتدائی اور وسطی تعلیم
میں یہ رسائل ضروری ہیں۔ قیمت مہر فی پارہ

پتہ حافظ محمد شفیع مدرسہ قرآنیہ فرقانیہ چوک لکھنؤ

کروی لیدر ورکس

۲۳ و ۲۵-ہیوٹ روڈ الہ آباد

چرمی سامان۔ انگریزی بوٹ اور جوتوں کا وہ مستند کارخانہ جو ایک اعلیٰ تعلیمیافتہ
اور نہایت ہوشیار ماہر فن کی زیر نگرانی ایک کثیر سرمایہ سے جاری کیا گیا ہے ہر قسم
کے بوٹ۔ شوز۔ سلیپرس۔ پمپ۔ چپل پنجابی و مغلئی نہایت ہوشیار اور باکمال
کاریگروں کی طیار کی ہوئی موجود رہتی ہیں۔ ہر فرمائش و آرڈر کی تعمیل نہایت
دیانتداری۔ کفایت اور تعجیل کیساتھ کیجاتی ہے۔ ایک انگریزی مثل ہے کہ حسین
و خوبصورت جوتا انسان کے تعزز پندار میں اضافہ کرتا ہے۔ ہم آپ کو نہایت
سستے داموں پر۔ نہایت اعلیٰ مال پیش خدمت کریں گے جو فیشن اور صفائی کے
لحاظ سے ولایت کے بہترین کارخانوں کو شرما دیگا۔ آزمایش شرط ہے

مینیجر کروی برادرس۔ ۲۳ و ۲۵ ہیوٹ روڈ الہ آباد۔

ادبِ اردو کا ایک بے نظیر اور عدیم المثال ماہانہ رسالہ۔ مضامین نظم و نثر کا بہترین مجموعہ جو ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو دفتر رسالہ آئینہ الہ آباد سے زیرِ ادارت **ابوالمعالی مولوی سید وحید الدّین احمد کڑوی** نہایت آب و تاب کے ساتھ شایع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ ایک مشترکہ سرمایہ کی معزز جماعت کی طرف سے جاری کیا گیا ہے جس کے ڈائرکٹروں کی مجلس میں آنریبل سر تیج بہادر سپرو۔ دیوان رادھے ناتھ صاحب کول۔ محمود علیخاں صاحب عرف آغا علیخاں صاحب تعلقدار۔ چودھری جمال احمد صاحب رئیس و زمیندار۔ محمد وصی علی صاحب تعلقدار جیسے معتبر اور ذی رتبہ رئیس شامل ہیں رؤسا و شہر اور بیرونجات کی ایک کافی تعداد جس میں خان بہادر حاجی عبد الباقی خانصاحب۔ نواب سید محمد عیسیٰ صاحب۔ حکیم سید منصور علی صاحب۔ پروفیسر علی امیر صاحب ایم۔ اے سید ماجد علی صاحب وکیل ہائیکورٹ۔ کنور سرجو پرشاد صاحب۔ منشی سمیع اللہ صاحب۔ چودھری سید غلام حیدر صاحب رئیس و زمیندار۔ سید ابو علی صاحب بیرسٹر۔ میر سجاد علی صاحب وکیل راجہ پور وغیرہ وغیرہ شریک ہیں۔ اکثر رئیس دیگر سرپرستی قبول و اعانت منظور کر چکی ہے آئینہ ہندوستان بھر میں اکیلا علمی رسالہ ہے جو اپنے قلمی معاونیں اور مستقل نامہ نگاروں میں حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب قبلہ مدظلہ العالی۔ مولوی سنال احمد صاحب علوی حمیدی سابق اڈیٹر الاحسان۔ خان بہادر سید فضل رب صاحب آنریری مجسٹریٹ۔ منشی سدرسن صاحب فسانہ نگار۔ سید محمد فاروق صاحب شاہ پوری۔ حضرت مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی۔ سید مسعود حسن صاحب ادیب اردو لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی۔ مولانا صفی صاحب لکھنوی۔ مولوی تصدق حسین صاحب صدق بانسی۔ مولوی محمد تبین صاحب کڑوی۔ حضرت جوش صاحب ملیح آبادی۔ شاہ نذیر صاحب ہاشمی۔ حضرت مہدی مچھلی شہری۔ جیسے بلند پایہ ذی مرتبت اور قابل قدر ادیب حضرات کے نام گنا سکتا ہے۔ اگر آپ اس ملک کی مشترکہ زبان کا سب سے زیادہ دلکش۔ اور نگاہ پرور مصور رسالہ دیکھنا چاہتے ہوں تو فوراً مینجر رسالہ آئینہ الہ آباد کو مخاطب کیجئے۔

قیمت سالانہ عہ ر ششماہی سے ر نمونہ کا پرچہ ۱۲/ر

سید صغیر حسن شاہ اسیر مینجر رسالہ آئینہ الہ آباد

اشتہارات

صبحِ شباب

یعنی

ابوالمعالی مولوی وحید الدین احمد صاحب اڈیٹر "آئینہ" کا زبردست اور معرکۃ الارا افسانہ جو نہایت اہتمام کے ساتھ اعلیٰ پیمانہ پر طبع کیا جارہا ہے۔ یہ افسانہ اپنی نوعیت۔ طرز بیان۔ لکھائی چھپائی اور جلد بندی کے لحاظ سے اپنا آپ نظیر ہوگا۔ دو سو پچاس صفحہ کی ضخامت۔ انگریزی ناولوں کا سا باتصویر اور رنگین ٹائیٹل پیج۔ کاغذ سفید ولایتی قسم اعلیٰ۔ کتابت و طباعت نہایت دلکش اور نگاہ پرور۔ بندش جزودار اور تقطیع "شلنگ ایڈیشن ناول" کی سی ہوگی۔ یہ کتاب ظاہری اور معنوی حیثیت سے زبان اُردو میں اپنے قسم کی پہلی کتاب ہوگی۔ مصنف کا نرالا اسلوب انشا۔ انسانی فطرت کا عمیق مطالعہ۔ حسن و عشق کے فطری جذبات کا صحیح مرقع۔ اس کتاب کی خصوصیات ہیں۔ یہ افسانہ اُردو ناول نویسی کی عامیانہ اور اخلاق سوز انداز تحریر کی شاہ راہ سے بالکل علیحدہ لکھا گیا ہے اور دنیائے افسانہ نویسی میں جدت طرازی اور ندرت بیان کے لحاظ سے اختراع فائقہ کا درجہ رکھتا ہے۔ قیمت فی جلد عمہ

جو حضرات ابھی سے اپنا نام فہرست خریداران میں درج کرالیں گے وہ رعایت کے مستحق ٹھہریں گے۔

المشتہر

منیجر "آئینہ" الہ آباد

آئینہ

یعنی

ادبِ اُردو کا آفتاب جو ہر انگریزی مہینے کی پہلی کو الٰہ آباد سے شائع ہوتا ہے۔

اشتہارات کے لئے سب سے موزوں اور مفید ذریعہ ہے۔ اس کی اشاعت کثیر اور مالی بنیادیں مستحکم ہیں۔ اس کے پڑھنے والے ہندوستان کے ہر گوشہ میں ہر طبقہ کے حضرات موجود ہیں۔ "آئینہ" اپنی دلکش اور روح پرور خصوصیتوں کی وجہ سے ہر تعلیم یافتہ انسان کا انیس و ہمدم ہے۔ مزید اطمینان کے لئے منیجر کا اشتہار ملاحظہ فرمائیے۔

نرخ نامہ اشتہارات

جگہ	ایک مرتبہ	دو مرتبہ	تین مرتبہ	چار مرتبہ	پانچ مرتبہ	چھ مرتبہ
ایک صفحہ (دو کالم)	دعہ	مدعہ	للعہ	صہ	مدصہ	دسہ
نصف صفحہ (ایک کالم)	ملے ر	دعہ	لہ عہ	عہ	سہ	دسہ
چوتھائی صفحہ (نصف کالم)	للعہ ر	ملے ر	عہ	عہ	مدعہ	علہ
⅛ صفحہ (چوتھائی کالم	عار	للعہ ر	ے ر	ملے ر	لعہ ر	عہ

قواعد اشتہارات

۱۔ اُجرت اشتہارات ہر حالت میں پیشگی لی جائیگی۔

۲۔ مدت معینہ کے اندر (بشرطیکہ اشتہار طبع نہ ہو گیا ہو) مضمون اشتہار تبدیل ہو سکتا ہے۔

۳۔ اشتہارات کے چربے (بشرطیکہ وہ تقطیع کا خیال رکھکر تیار کئے گئے ہوں) قابل قبول ہونگے۔

۴۔ معاہدۂ اشتہارات بعد از تکمیل منسوخ نہیں ہو سکتا۔

۵۔ اشتہاروں کے متعلق تصاویر کے بلاک تیار کرنے اور بنوانے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ اس امر کے متعلق براہ عنایت منیجر آئینہ سے خط و کتابت کیجئے۔

منیجر "رسالہ آئینہ" الٰہ آباد

اسٹینڈرڈ پریس الٰہ آباد میں باہتمام بابو شمبھر ناتھ بھارگو چھپا

الہ اباد